تیرے اُفق بے حدودو

بے ثغور

سلمٰی اعوان

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

اُوپر والے

ایک بار نہیں،سو بار نہیں، ہزار بار نہیں،
لاکھ بار نہیں، کروڑ بار نہیں، اربوں بار نہیں،
کھربوں بار بھی نہیں۔
اس سے آگے میری گنتی بس
سمجھو سانسوں کی ہر تار کے ساتھ،
مجھے تیرا شکریہ ادا کرنا ہے۔
ال اُندلس اور سمرقند و بُخارا دیکھنا خواب تھے۔
بچپن اور جوانی کے خواب۔
تعبیریں دینا صرف تیرا ہی کام ہے۔

ترتیب

میرا طوافِ زیارت و حج

باب1 میرا طواف زیارتِ حج

سفرِ اسپین

باب1 تین چوہیاں میڈرڈ کے لیے نکلیں

باب2 میڈرڈ

باب3 غرناطہ کے لیے روانگی

باب4 اُندلس کی دلہن

باب5 غرناطہ کا بیٹا گارشیا لورکا، سپین کا ایک عظیم شاعر، ایک توانا انقلابی آواز، کامیاب ڈرامہ نویس اور مصور

باب6 سپین کا کوہِ نور الحمرا

باب7 غرناطہ کا دل البیازین

باب8 سیکرومنٹو کے جپسی اور اُن کی غاریں

باب9 قرطبہ کے لیے روانگی

باب10 مسجد قرطبہ

باب11 قدیم قرطبہ

باب12 میڈرڈ کے لیے واپسی

سفرِ ازبکستان

باب1 تاشقند وسطِ ایشیا کا نگینہ

باب2 علی شیر نوائی

باب3 سمرقند

چند باتیں آپ سے

2006ء میں حج کے لئے گئی۔ واپسی پر حال احوال تحریر کرنے کا خیال آیا۔ مگر پھر دل ہی مائل نہ ہوا۔ ایمان کی کمی تھی یا جذبوں کی۔ بڑے بڑے لوگوں کے لکھے ہوؤں کے سامنے مجھ بونی کی حقیقت ہی کیا تھی؟

ایک باب کسی رسالہ کی فرمائش پر لکھا۔ بس اُسے ہی کافی سمجھا کہ میرے سچ نے بہت سارے لوگوں کو ناراض کر دیا تھا۔

''ازبکستان گئی تو چاہتوں کے ساتھ تھی کہ ساتھ سہیلیاں تھیں مگر دو باب سے زیادہ نہیں لکھ سکی کہ نئے پراگے میں پڑ گئی۔ جنگ سنڈے میگزین کی فرمائش تھی فلسطین پر ناول لکھنے کی۔ ایسا گھمبیر موضوع۔ اتنے بڑے کینوس پر پھیلا ہوا۔ زمانوں پر بکھرا ہوا۔ بڑی طاقتوں کی مکاریوں اور سازشوں میں بُنا ہوا۔ ناول نے جیسے نچوڑ کر رکھ دیا۔ کوئی ڈھائی سال اُس کی نذر ہوئے۔

2008 میں عراق اور شام کا سفر کیا۔ امریکہ، عراق جنگ کی ایک کہانی بُلا رہی تھی۔ کہانی لکھی اور سفرنامے میں اُلجھ گئی۔ شام پر سفرنامہ تیار کیا تو جنگ اس کے سر پر مسلط ہوگئی۔ اب امن کی باتیں اپنی جگہ پر خوبصورت ملک آگ اور خون میں نہا رہا تھا۔ ازسرنو اُسے مرتب کیا۔

سپین بھی تو بچپن کے بہت سارے خوابوں میں سے ایک تھا۔ شکر اُس کا لے گیا وہاں۔ چاہتوں کی آنکھ سے اُسے دیکھا۔

سلمیٰ اعوان

میرا طوافِ زیارت و حج

باب 1 میرا طوافِ زیارت وحج

- سفرِ حج، طوافِ وداع میں برپا ہونے والی قلبی کیفیات کا مختصراً احوال
- حج میں بھی بشری کمزوریاں اپنے اظہار سے باز نہ آئیں

سچی بات تو یہی ہے کہ اب اگر مجھے اس شدنی کا علم ہوتا کہ جونہی میں اپنے پُرانے اور حج کے سفری دوستوں مسعود بلوچ اور ان کی اہلیہ دردانہ بلوچ سے جدا ہو کر باب اجیاد کے صحن میں قدم رنجہ فرماؤں گی۔ میاں کے دل و دماغ میں جانے کب کا پکتا ہوا گلے شکوؤں کا لاوہ ایک دھماکے سے پھٹ کر مجھے پھیتی پھیتی اور لیر لیر کر دے گا۔ تو میں ہی بندے کا پتر بن جاتی۔ جھاڑ پھیرتی سب پر۔ گز بھر لمبی زبان کو نتھ ڈال لیتی۔

پٹڑی پر دوڑتے بھاگتے انجن کی طرح میاں کی زبان ارد گرد کا لحاظ رکھے بغیر گولہ بارود برسا رہی تھی۔

''ہوا نہ لگنے دینا گُتھلی کو۔ کلیجے سے لگائے رکھنا ڈالروں ریالوں کو۔ کہو گی تو قبر میں بھی رکھوا دوں گا تمہارے ساتھ۔''

پہلے تو میں ہونق کھڑی بٹر بٹر اس کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچے چلی جا رہی تھی کہ آخر اسے ایکا ایکی ہوا کیا ہے؟ گو یہ کچھ ایسی انوکھی بات بھی نہ تھی کہ ایسے دورے وقتاً وقتاً پڑنے معمول کی بات تھی۔

پر قہر کا تو سُنتے ہی مجھے جیسے پتنگے سے لگ گئے۔ حج کا بنیادی اسباق صبر، برداشت اور تحمل جیسے الفاظ درختوں پر بیٹھے پرندوں کی طرح جو شکاری کے پہلے فائر سے ہی اڑ پڑ جاتے ہیں۔ میرے دماغ سے بھی اسی طرح اُڑنچھو ہو گئے تھے۔ کہاں کھڑی ہوں؟ اس مقام کا تقدس اور حرمت کس قدر ہے۔ یہ سب احساسات رفو چکر ہوئے۔ کون سی میں بڑی روایتی، شوہر سے دبنے یا پتی ورتا قسم کی بیوی تھی۔ سو پھٹ پڑی۔

''تم نے تو گویا درازی عمر کا پٹہ لکھوایا ہوا ہے نا۔ تمہیں تو مرنا ہی نہیں۔''

میرے پیارے قارئین اِس جھگڑے کی مختصر سی تفصیل سے آپ تھوڑا سا تو سمجھ ہی گئے ہونگے۔ مگر اِس سارے قضیے کی گرہیں کھولنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو ذرا پیچھے لے چلوں۔

یہ آٹھ ذی الحج کی صبح ہے اور منیٰ کے لیے روانگی۔ آج سویرے کے نہانے دھونے میں خاصا اہتمام تھا۔ سنبھالا ہوا سفید جوڑا زیب تن کرنے عبایا اور حجاب پہننے کے بعد خود کو آئینے میں دیکھا تو عجیب بندریا کا سا چہرہ نظر آیا۔ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے عکس دیکھتی اور کچھ سوچتی رہی پھر جیسے سمجھ آنے لگی تھی۔

بھئی ایسا نظر آنا تو فطری تھا کہ گزشتہ ہفتہ بھر سے حرم کے آنگن میں مشرقی یورپ کے جارجیا، بلغاریہ ہنگری کوسوو بوسنیا اور وسط ایشیا ازبکستان، تاجکستان، کرغزستان، ترکمانستان اور ایران جیسے ملکوں کی پریوں کے حُسن جہاں سوز کو یہ گنہگار آنکھیں دیکھتی آرہی تھیں۔ بس یہی لگتا تھا جیسے حوروں کے غول آسمان کی چھت پھاڑ کر حرم کے آنگن میں اُتر آئے ہیں۔ ایک اُن کے نور سے دمکتے چہرے اس پر ستم کہیں سفید اور کہیں سیاہ پہناوے۔ نگاہیں جو اُن کی جانب اُٹھتی تھیں تو پلکیں اپنا راستہ کھوٹا کر لیتی تھیں۔

تاہم یہ امر بھی باعث طمانیت تھا کہ شکر گزاری کی لہریں مچلتی، شور مچاتی دل سے

آ ٹکراتیں اور متوجہ کرتیں کہ دیکھو دیکھو افریقہ کے بہت سے ملکوں کی بدصورتیاں اپنے کرّ وفر کے ساتھ بھی موجود ہیں۔ایسی ویسی بدصورتیاں،چیختی چنگھاڑتی،شور مچاتی آپ کو خواہ مخواہ اپنی جانب متوجہ کرتیں، دیکھنے پر اُکساتیں،آپ کے کانوں میں ایک رسیلا گیت گنگناتیں کہ اللہ کاشکرادا کرو جو تمہیں وہاں ان کے ہاں پیدا کر دیتا تو بولو کیا کرتیں تم؟

اب ظاہر ہے گورے چٹے اور کالے شارنگوں کے بین بین جس مقام پر کھڑی تھی وہاں اندر سے نہ سہی اوپرے دل سے کچھ ماڑی موٹی شکر گزاری ہوتی۔شروع کے دنوں میں تو بڑی باقاعدگی سے ہوئی بعد میں مدھم پڑتی گئی۔

حقیقتاً یہ دُنیا کی یقیناً واحد جگہ ہے جہاں خوبصورتیوں اور بدصورتیوں کے امتزاج انوکھے اور نرالے انداز میں کہیں پاس پاس،اور کہیں کہیں جپھیاں ڈالے ملتے ہیں۔

قبول صورتی کی سند اپنے آپ کو دینے کے باوجود جیبی آئینے کو اٹیچی کیس میں اس نیت کے ساتھ پھینکنے سے میں باز نہیں رہ سکی کہ آئندہ سعودی عرب کی سرزمین پر مجھے اس میں اپنی صورت ہرگز نہیں دیکھنی۔

گاڑی میں جب بیٹھے تو اندر کی فضا اُس سرمدی نغمے سے گونج رہی تھی جو اس تقریب کی جان تھا۔

''لبیک اللّٰھم لبیک۔ میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں۔''

کتنا سوز کتنی سپردگی کتنی نغمگی تھی اس کے بولوں میں۔میں نے اپنی آواز کو اس میں شامل کیا۔بس جب چلی تو آوازیں ہلکی ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں۔شاید لوگ تھک گئے تھے کیا۔پر ابھی تو پہلی پونی ہی کاتی تھی۔

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے گنگناتے گنگناتے جھومتی جاؤں WHIRLING DERVISHES کی طرح فضا میں رقص کرتے کرتے فضا میں ہی

تحلیل ہو جاؤں۔

امجد اسلام امجد کی میں " حاضر ہوں میں حاضر ہوں" یاد آئی تھی۔اُسے زیرِ لب گنگنانا شروع کیا۔

اے ربِّ ملائک جنّ و بشر	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
خدمت میں تیری شرمندہ نظر	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
جو تیری ثنا کے لائق ہو،	اک لفظ بھی ایسا پاس نہیں
کیا تابِ سخن، کیا عرض ہنر،	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
قطرے کی نگاہ حیران پر،	دریا کی حقیقت کیسے کُھلے
میں جانتی ہوں یہ بات مگر	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
میرے چار طرف ہیں دروازے	میرا سرمایہ کچھ اندازے
مجھ بے خبر کو بخش خبر	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
یہ ارض و سما کی پہنائی	یہ میری ادھوری بینائی
ہے شوق سفر ہی زادِ سفر	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
میرے کان تیری آہٹ سے بجیں	میرے سانس تیری خوشبو میں بسیں
میری آنکھیں اپنے خواب سے بھر	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں
اے نورِ ازل، اے حسن ابد	سبحان اللہ، سبحان اللہ
رہیں روشن تیرے شمس و قمر	میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں

اِس شاعر بے بدل کی اِس حمد یہ نظم سے وابستگی کی داستان بھی بڑی دلچسپ اور عجیب سی ہے۔ہم میری، خلیری، چچیری اور پھوپھیری بہنیں بچپن ایک گھر میں گزارنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے خصوصی محبت رکھتی ہیں۔گزرتے وقت اور زندگی کے جھمیلوں نے

اِس محبت کو نہ گہنایا اور نہ اس پر کوئی اثر ڈالا۔عمرے پرمل کر جانے کا پروگرام بھی ہماری ایسی ہی محبتوں کا نتیجہ تھا۔میری یہ بہنیں کوثر ،عفت اور شفقت دینی مسائل پر بھی اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔جب عمرے کا پروگرام بنا وہ جی جان سے اس کی تیاریوں میں مصروف ہوگئیں۔مجھے بھی مناسک عمرہ وحج پرمبنی ایک کتاب لا دی۔

وہ طواف کی لمبی لمبی دعائیں بہتے پانی کی سی روانی کی طرح پڑھتی تھیں۔میں نے بھی بہتری کوشش کی پر میرے بُھس بھرے بھیجے میں کچھ سمایا ہی نہیں۔

زِچ ہوکر کتاب میز پر رکھ دی اور شہاب نامہ میں درج قدرت اللہ شہاب کے اُس واقعے کو مشعل راہ بنایا کہ جب فیلڈ مارشل ایوب خان عمرہ کیلئے جا رہے تھے۔شہاب صاحب نے اُن سے مخصوص دعاؤں کو یاد کرنے بابت پوچھا۔انہوں نے جواباً کہا۔

''میں نے سوچ لیا ہے۔مجھے خدا سے بس یہ کہنا ہے پروردگار میں تیرے حضور حاضر ہوگیا ہوں۔جیسا بھی ہوں۔قبول کر۔''

بس تو یہی کلیہّ بہترین ہے یہی کم خرچ بالانشین والا۔ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ چوکھا آئے والی صورت ہے۔بات تو صرف منظوری کی ہے۔نظرعنایت اور مہربانی کی۔

بس تو میں سارے جھنجھٹوں سے آزاد ہوگئی تھی۔

مگر ہوا کیا کہ طواف میں انہوں نے جب لمبی لمبی دعائیں پڑھنی شروع کیں۔مجھے محسوس ہوا میں تو خالی ہوں۔نہ کوئی جذب کی کیفیت ،نہ کوئی تلاطم بھرے جذبات،سوکھی بنجر زمین کی طرح سڑتی بلتی چند چکر کاٹنے کے بعد میں باہر نکل آئی۔دل گرفتہ سی سیدھی جا کر برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔کالے کوٹھے کو تکتے میں اُس سے مخاطب ہوئی۔میں خالی کیوں ہوں؟ میری آنکھیں گیلی کیوں نہیں۔اتنا پینڈا مار کر میں کِس لیئے آئی ہوں؟ صُبح سے ظہر تک کا وقت بیت گیا۔نماز بھی پڑھی ہے مگر تہی دامن ہی

ہوں۔ سامنے گھر کو تکتی ہوں مگر کوئی تحریک کیوں نہیں ہو رہی ہے۔

پتہ نہیں پھر کیا ہوا؟ جیسے برق سی کوند جائے والا معاملہ ہی تھا۔ کبھی کی پڑھی ہوئی امجد اسلام امجد کی یہ نظم جو کہیں خواتین ڈائجسٹ میں چھپی نظروں سے گزری تھی اور جو اتنی اچھی لگی تھی کہ بہت بار پڑھنے کے بعد زبانی یاد ہوگئی تھی۔ ذہن کے کینوس پر اُبھری۔

''میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔ اے ربّ ملائک جنّ و بشر۔ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔''

جیسے ندی میں باڑھ آجائے۔ جیسے دریا میں سیلاب آجائے۔ میرے اندر بھی طوفان آ گیا تھا۔ میں بھاگتی ہوئی جا کر اُس قطار میں شامل ہوگئی جو دائروں میں رقصاں تھی۔

''میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں۔ بس نظر عنایت ہوگئی تھی۔''

پھر میرے سارے ہی دن بھرے ہوئے، بھیگے ہوئے گزرے۔ اِس نسخہ کیمیا میں بہت سے اور نسخے بھی میں نے ملا لئے تھے۔ محبتوں بھرے جذبات کی ایک ایسی کاک ٹیل میرے ہاتھ لگ گئی تھی کہ مجھے تو کسی کی حاجت ہی نہ رہی تھی۔ یہی کلیہ حج میں بھی کام آ رہا تھا۔ عمرے والی میری بہنیں بھی حج کے لئے آئی ہوئی تھیں۔ بس ذرا ہمارے پروگراموں میں بے ترتیبی سی ہوگئی کہ میری خواہش کے برعکس میاں نے اپنے جگری یار کے ساتھ پروگرام بنالیا تھا۔

اور اب میں بس میں بیٹھی وہی نظم دہرا رہی تھی۔

میری آنکھیں بند تھیں۔ ان کے گوشے نم تھے۔ میرا سارا سر یہ جذب و آگہی میں بھیگا ہوا تھا۔

بس نے ایک جھٹکا کھایا۔ خمار میں ڈوبی آنکھیں کھلیں۔ اطراف میں مکے کی پہاڑیاں تھیں۔

تو کیا میرا احمد میرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہی راستوں پر چلتا ہوا منیٰ کی طرف گیا تھا؟

آسمان نیلا کچور تھا اور جیسے کوئی مجھے دیکھتا تھا۔

عقبی نشستوں پر سے کسی نے اُونچی آواز میں بیان پڑھنا شروع کیا۔کان بردوش آواز ہوئے۔

ایک بار کوئی چھ لاکھ افراد نے حج کیا۔پروردگار سے پوچھا گیا باری تعالیٰ کتنے لوگوں کا حج قبول ہوا۔فرمایا

''صرف چھ لوگوں کا۔''

میری ساری حسیّات ایک پل میں ہوشیار ہو کر اگلے لفظوں کی منتظر ہوئیں۔پھر فرمایا گیا۔وہ چھ لوگ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے ان کی شرکت ہمیں پسند آئی اور ہم نے ہر بندے کے طفیل لاکھ بندوں کو بخش دیا۔اور یوں سب کا حج قبول ہو گیا۔

مجھے تو جیسے کسی نے دہکتے تنور میں پھینک دیا تھا۔پہلے تو خود کو قابو کرنے میں بہتری کوشش کی یہ کہتے ہوئے کہ ماحول اور جگہ کسی قسم کے کھڑک کھڑاک کی متحمل نہیں۔کچے،ادھ پکے عقیدے کے لوگوں کے درمیان سچی اور کھری باتیں۔ایک آدھ بھی مشتعل ہو گیا اور تو تکار کی کیفیت پیدا ہو گئی تو بیڑا غرق۔صبر و تحمل حج کا بنیادی مقصد فوت۔

پر نہیں جی ایسی دانا باتوں پر عمل تو کبھی سیکھا ہی نہ تھا۔تھوڑا سا علم اِسی لئے تو کہتے ہیں خالی برتن کی طرح زیادہ بجتا ہے۔اپھارے کی سی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

آپے میں نہ رہی۔

بس میں واہ واہ سبحان اللہ کا شور بلند تھا۔مولا کے بخشنے کے انداز نرالے ہیں جیسی باتیں تھیں۔

بہت ہو گیا دل نے کہا جو ہو گا دیکھا جائیگا۔ ہمارا توجح کھوٹا ہو گیا نا۔

میں ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی تھی۔

''یہ کون پڑھ رہا تھا۔ کچے اور متزلزل عقیدے والا۔''

اللہ معاف کرے انداز ہو بہو تھانیدار کا سا تھا۔

''اس طرح کی غلط روایتوں اور بیانوں سے مت گمراہ کریں ہمیں۔ ارے یہ جو دُنیا بھر کے کونے کونے سے لوگ گھر بار چھوڑ اسکے عشق میں ڈوبے، سفر کی مصیبتیں اور صعوبتیں برداشت کرتے کرتے یہاں تک آئے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو انہیں۔ انکے لبوں پر اسکی وحدت کے نغمے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں اس کی چاہت کے فسانے ہیں اور وہ اوپر بیٹھا ان کی حاضری قبول نہیں کرے گا۔ کیوں؟ اب پوری بس کے سامنے سوالیہ نشان اٹھائے کھڑی ہوں۔

بھئی کیوں نہیں کرے گا؟

کرے گا اور ضرور کرے گا۔ اور یہ جو طفیل اور بدولت میں قبولیت ہے ہمیں تو ہرگز قبول نہیں۔ بندے نہیں ہیں ہم اس کے۔ چلو جی گنہگار ہیں، بدکار ہیں۔ پر ہیں تو اُسکے نا۔ بھئی ہم نے تو ٹھک کر کے اُس کے کلیجے سے لگنا ہے بس۔''

پتہ نہیں اتنی جذباتیت کہاں سے آ گئی تھی لہجے میں۔ میاں آگے ذرا فاصلے پر بیٹھا تھا۔ آنکھ دکھائی تیوریوں سے گھُرکی دی کہ بس کرو۔ فضول بولے چلی جارہی ہو۔

میں نے بھی یوں ہاتھ ہلایا جیسے کہنا مقصود ہو۔

''ارے مجھے نہیں کسی کی پرواہ۔ بات سچی اور دل کو لگتی کروں گی۔''

مجمع کی اکثریت چونکہ مجھ جیسے گنہگاروں کی سی تھی اسی لیے تائیدی کلمات کی بلندی میں زور تھا۔

منیٰ تو گویا جنگل میں منگل کا منظر پیش کرتا تھا۔ خیمے یوں دکھتے تھے جیسے لاکھوں لقی کبوتریاں قطار در قطار بیٹھی ہوں۔ سفید احرام میں لپٹے لوگ باگ مست خرام اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے کہیں بیٹھے کہیں چلتے کہیں باتیں کرتے اپنی اپنی دُھن میں مگن تھے۔

آنکھوں کو نیچی رکھنے کا حکم اوپر والے نے ضرور دیا ہے مگر مردوں کو۔ اوڑھنیوں کے گھونگھٹ کاڑھنے کا عورتوں کو کہا ہے۔ اپنے گھر میں اُس نے دونوں کو اِس پابندی سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔

سفر تو گو بڑا تقدس والا تھا مگر آنکھوں پر پہرے تو نہیں بٹھائے جاتے نا۔ اب اگر حجاب اور عبایا میں لپٹے نسوانی چہرے اور سراپے قلب ونظر پر بجلیاں سی گراتے تھے تو وہیں احرام سے جھانکتی مردانہ وجاہتیں اور کوجے پن بھی متاثر کرتے تھے۔

مکتب نمبر 12 کے 16 نمبر خیمے کا فرش سُرخ قالینوں اور اس پر بچھے دو ڈھائی گز لمبے اور ایک گز چوڑے روئی کے گدوں سے مزین تھا اور ہر گدے کے سرہانے ایک تکیہ اور پائنتی پر چادر پڑی تھی۔ اندر داخل ہوئی تو خواتین کے ریوڑ میں سے کسی نے کہا۔

’’یہ ایک قبر کا تصور اور اس کی عملی تربیت کی ٹریننگ ہے۔‘‘

میں نے کسی قدر حیرت سے یہ سُنا اور مسز بلوچ سے کہا۔

’’میں نے تو یہ کہیں نہیں پڑھا۔‘‘

سارا سریر جذباتی پھوار میں بھیگا ہوا تھا۔ مُومُو اس کی محبت کے گیت گا رہا تھا۔ اسی لیے بیٹھتے ہی میں نے بیگ سے ڈوپٹہ نکالا۔ سر پر رکھ کر اس کا گھونگھٹ سا نکالا اور ذکر میں مصروف ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی ’’خدایا‘‘ کہتے ہوئے سر زمین پر رکھ دیا اور گھگھیاتے اُس کرب کو لفظوں کی صورت باہر نکالنے لگی جو میری نس نس میں رچا ہوا تھا۔

’’مجھے بتا میں کیا کروں۔ تجھے پیکر میں ڈھال کر تیرے لمبے چوڑے پاؤں

میں بیٹھنا، تیرے زانوؤں پر سر رکھنا اور تجھ سے لپٹ کر بھل بھل رونا میرے کھیتارس کیلئے کتنا ضروری ہے؟ بس یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تیری ہستی کو کسی وجودی پیکر میں ڈھالنا اور اُسے کسی تصویری پیرھن میں دیکھنا کیا میرے عقیدے کی خلاف ورزی تو نہیں۔

بتا نا کیا کروں؟ کیسے تیری شبیہ بناؤں۔نور کی آبشاروں میں تجھے کیسے رواں کروں۔قوس وقزح کے رنگوں میں تجھے کیسے رنگوں؟''

اب تصوراتی یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑوں میں کسی بے بس اور لاچار انسان کی طرح دردناک آوازوں سے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ کتنے روپ بدلے۔کس کس انداز میں آہ وزاری کی۔

کوئی گھنٹہ ڈیڑھ بعد موبائل پر میاں کے پیغام نے توجہ کھینچی۔

''تمہاری ممیری، پھوپھیری بہنیں اور بھائی تھوڑی دیر بعد مکتب کے باہر آنے والے ہیں۔ بیرونی سڑک پر جا کر کھڑی ہو جاؤ تا کہ اُنہیں نظر آسکوں۔''

منیٰ میں کسی کو ڈھونڈنا کونسا کسی معرکے سے کم تھا۔میرے کزنز ایسے کاموں میں ہمیشہ سے بڑے تیز ہیں۔ باہر کھڑے تھے۔سب چونکہ مجھ سے چھوٹے ہیں اس لئے اُن کے منہ ماتھے چوم کر کچھ کھانے پینے کے لیے قریبی سٹال پر جا کھڑے ہوئے۔

دفعتاً میری ایک کزن نے چائے کا چھوٹا سا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''کل کا دن بہت اہم ہے۔عرفات میں ظہر سے مغرب تک دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہے۔کھڑے ہو کر دعائیں مانگنے کی تاکید۔ جتنا ہو سکے خود کو کل کے لیے سنبھالو۔کل رونا ہے، گڑگڑانا ہے، عجز و عاجزی سے اُسکے سامنے سر کو جُھکانا ہے۔''

''اور آج؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''آج آرام کرو۔بس معمول کی نمازیں۔''

عفت کی کہی گئی بات نے جیسے میرے کلیجے پر گھونسہ مارا۔

''کل ظہر کے بعد مغرب تک بڑا اہم وقت ہے۔'' عفت نے کہا۔

بوکھلا کر میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''یہ آج کا اتنا رونا دھونا یونہی غارت گیا کیا؟''

جب واپس آئی تو بے دلی کا شکار تھی۔ چادر تان کر لیٹ گئی۔ پر مجھ جیسی کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ باتھ روم گئی۔ کوئی صفائی کرنے والا نہیں تھا۔ پاکستان کی ناخواندہ بوڑھی عورتوں نے گند ڈال رکھا تھا۔ اس سمے میرا جی شدت سے چاہا کہ کاش میرے پاس سامان ہوتا۔ کاش میں مکّہ سے وم کے ڈبے، برش، وائپز اور جھاڑو لے آتی۔ شلوار کے پائنچے اُٹھا سارے باتھ روموں کی دھلائی کرتی۔ انہیں لشکاتی اور چمکاتی۔ شاید اسی طرح کچھ میری بخشش کا سامان ہو جاتا۔

عرفات کا میدان کم اونچی نیچی بے برگ و گیا پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ سفر کے دوران دھیان تو احمد مجتبیٰ میں ہی پھنسا رہا۔

خیمے میں داخل ہو کر سامان ابھی رکھا ہی تھا کہ اندر باہر کے لیے مچلنے لگا۔ چٹائی اور جائے نماز کے ساتھ قدرے اوپر ایک چھدری چھاؤں والے درخت کے نیچے پڑاؤ ڈالا۔ پر آج میرا دیدہ ہوائی ہو رہا تھا۔ نہ یکسوئی کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ نہ کچھ پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ آنکھیں دائیں بائیں گھومتی پھرتی تھیں۔ کبھی اچک کر نیلی چھت کو تکنے لگتیں۔ کبھی دھوپ کی تیزی اس دسمبر کے مہینے میں ایسی گرمیوں میں تو حشر کا سا سماں ہوتا ہو گا کے موازنے میں اُلجھ جاتیں۔

''ہائے میں کیسی فضول سوچوں میں اُلجھی ہوئی اتنے قیمتی وقت کو ضائع کر رہی ہوں۔''

اندر کی اِس لتاڑ نے تھوڑا سا کام کیا۔

میں نے سر جھکایا اور اُن مخصوص دعاؤں کو پڑھنے کی کوشش کی جو کچھ یاد تھیں۔

کوڑھ مغز تو نہیں تھی پر مجھے کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔

''چلو چھوڑو۔ دعائیں نہیں پڑھتی۔ اُس سے باتیں کرتی ہوں۔''

ابھی باتیں کرتے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ آواز آئی۔

''اری او بی جن۔''

حیرت سے سر اُٹھایا۔ دور دائیں ہاتھ ایک ادھیڑ عمر عورت چٹائی پر سامان بکھیرے بیٹھی تھی۔ مخاطب میں ہی تھی۔ جن لفظ تو یقیناً اجنبیت والا نہیں تھا پر اپنی ذات کے لیے یہ مجھے حد درجہ مضحکہ خیز محسوس ہوا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے ماتھے پر ہاتھ کا چھجہ سا بنا کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ابھی جو عورت گزری ہے مجھے پانچ ریال دے رہی تھی۔''

''تو لے لینے تھے۔'' مجھے ہنسی آ گئی تھی۔

''ارے باؤلی ہو تم۔ خیرات کر رہی تھی مجھے۔ دھتکار دی میں نے۔ پر بھول ہو گئی۔ دس ریال اس کے منہ پر مارتی تو اُسے پتہ چلتا۔''

عورت بڑی دلچسپ لگتی تھی۔ اللہ میاں سے باتیں بند کر کے اس کے بندے سے باتیں کرنے چل دی۔

تم نے عورت کو میری طرف بھیج دینا تھا۔ میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیوں غریب ہو؟''

گہری سانولی رنگت پر سجی ہلکے براؤن رنگ کے شیشوں والی عینک سے مجھے بغور

دیکھتے ہوئے پوچھا گیا۔

''سچی بات بتاؤں۔غریب تو نہیں ہوں پر کیا کروں یہ دل بڑا غریب ہے۔''

ہنسی رُکنے میں نہ آ رہی تھی۔ خاتون بنگلور کی تھی۔ خاصی امیر عورت جس کے مکان اور دو کانوں کا کرایہ کوئی پچاس ہزار مہینہ بنتا تھا۔میرے پوچھنے پر کہ حالات کیسے ہیں وہاں کے؟ کسی قدر رعب دبدبے سے بولی تھی۔

''ارے بڑے اچھے ہیں۔ بڑے سکھ، سکون، شانتی اور پیار سے رہتے ہیں ہم ہندو مسلمان۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں اور جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو گھروں میں بھی ہوتے رہتے ہیں۔''

''لو ارے میں نے تمہیں مبارکباد تو دی ہی نہیں۔حج ہو گیا تمہارا۔''

وہ کیسے؟ میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

آنے سے قبل کوئی لٹریچر پڑھتی تو کچھ پلے ہوتا۔ میں تو آخری وقت تک چابیوں کے گچھوں اور بینکوں کے چکروں میں پڑی ہوئی تھی۔

''ظہر کے بعد قبولیت ہو جاتی ہے۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ابھی نمازوں کا تصفیہ باقی تھا۔مسجد نمرہ کو دیکھنے کی تا کا جھانکی کی پر چار پانچ کوس کا فاصلہ درمیان میں تھا۔ پہاڑی پر چڑھی تو نئے منظر سے آشنا ہوئی۔تاحد نظر ڈھلانوں پر بکھری سفیدیاں کچھ ایسی ہی نظر آئیں جیسے کُرتوں کے دامنوں پر سفید موتی تارے ٹانکے ہوئے ہوں۔خدا کی مخلوق اس کے حضور کھڑی بیٹھی اس کی ثنا میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں گھائل ہونا چاہتی تھی۔ پر پتہ نہیں کیوں ہو نہیں پا رہی تھی۔ پھر جیسے سماعت سے ایک میٹھی سی فریاد ٹکرائی۔مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھی ایک بوڑھی عورت بڑے مجبوبانہ انداز

میں کسی سے باتیں کرتی تھی۔

''وے میرے سونیا، میرے مٹھڑ یا، توں اُتے بیٹھا کنیاں بولیاں پیا سُن دا ایں۔ میری وی بولی سُن۔''

ترجمہ: اے میرے پیارے خوبصورت خدا تم اوپر بیٹھے کتنی بولیاں سُن رہے ہو۔ میری بھی بولی سن لو۔

کیسے لفظ تھے جو بھڑ کے اور انہوں نے تنکھوں کے ڈھیر کو آگ لگا دی۔ بھانبڑ مچ اُٹھا۔

اس کے سادہ لوح بندوں کی دل نوازیاں اور اُس کی ان اداؤں کو سراہنے اور پسند کرنے کے انداز بھی کیا نرالے ہیں۔ اپنے داماد عمران کا سُنایا ہوا ایک واقعہ بھی یاد آیا تھا جسے اس کے باس ایر کموڈور شاہد خان نے اپنی حج واپسی پر سُنایا تھا۔ ایر کموڈور مقام ابراھیم پر تھے جب ان کے کانوں میں آواز آئی۔

''وے میرے ربا سوہنیاں میں زینب بی بی چک گ ب بانوایا نوالہ سمندری توں چوکھے پینڈے مار دی ول تینوں ویکھن آئی آں تے توں اپنے بوہے بند کیتے ہویاں نیں۔''

صاحب بہادر نے پیچھے مڑ کر دیکھا جہاں سے یہ آواز اُن تک پہنچی تھی۔ اُدھیڑ عمر کی ایک عورت آنکھوں میں اشکوں کا طوفان لئے سامنے کالے کوٹھے کو دیکھتی تھی۔ دفعتاً ایک شور و غوغا سا بلند ہوا۔ سیکورٹی کا خصوصی عملہ جیسے ہٹو ہٹو راستہ دو کا سگنل دیتا آگے بڑھنے لگا معلوم ہوا کہ چند غیر ملکی اہم شخصیات کی آمد ہے۔ اللہ کا گھر اُن کے لئے کھلنے والا ہے۔ شاہد خان کا کہنا تھا کہ وہ ایک جانب رک کر یہ دیکھ رہے تھے اور پھر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ وہ سیدھی سادھی سی زینب بی بی اُن کے ساتھ جیسے گھسیٹی

ہوئی جا رہی ہے اور ان کی حیرت کی یہ بھی انتہا تھی کہ جب انہوں نے دیکھا کہ سفید چادر میں لپٹی وہ زینب بی بی سب سے پہلے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔

واہ کیا رنگ ہیں تیری قبولیت کے۔

دیر بعد نیچے اُتر کر اپنی پُرانی جگہ پر آئی کہ نماز کی ادائیگی کرنی تھی۔ پاس ہی کسی نے خیمے تان کر قنات لگالی تھی۔عورتوں، بچوں اور برتن بھانڈوں کی آوازیں تھیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئی۔ایک لڑکا لبن (گاڑھی لسی) کی سیل بند بوتل لایا۔بسم اللہ کہہ کر میں نے اُسے تھاما۔ میں پیاسی بھی تھی اور دل کی غریب بھی۔

سورج بہت تیزی سے نیچے چلا گیا تھا اور لوگوں نے بلندیوں سے اُترنا شروع کر دیا تھا۔ خیمے کے دروازے پر کھڑے مسعود بلوچ اپنی اہلیہ دردانہ بلوچ سے اُس کا سامان پکڑ کر اُسے ہلکا کرتے ہوئے پوچھتے تھے کہ بھابھی کہاں ہیں؟

اور بھابھی اپنا سامان سمیٹ کر اُسے اُٹھاتے ہوئے رشک بھری نظروں سے دردانہ کو دیکھتے ہوئے اپنے میاں کے بارے میں سوچتے ہوئے کہ اُس نے صبح سے اب تک صورت نہیں دکھائی تھی۔ کسی ضرورت کے بارے میں پوچھا تک نہیں تھا۔ مُنا کا کا بنا ہوا ہے۔راستے پر چل پڑی تھی۔

مجھے اپنی کوتاہیوں اپنی کمزوریوں اپنی خامیوں کا اعتراف کہ وہ عرفات کے میدان میں بھی اسی طرح میرے اندر براجمان تھیں کہ جونہی میں نے میاں کو اپنا اور دوست کا بیگ اُٹھائے دیکھا۔حسد کے ناگ کی پھنکاروں نے مجھے جلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ آنسو جو میری کوشش بسیار کے باوجود میری آنکھوں سے نہیں ٹپکے تھے بڑی آسانی سے گالوں پر بہنے لگے۔ دُھندلائی آنکھوں سے ڈوبتے سورج کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے روندھے گلے سے کہا۔

''تجھے میرے گھر آنا اور یہاں رہنا پسند ہی نہیں۔تو اسے کاٹھ کباڑ سے بھرے رکھنا چاہتا ہے تاکہ جواز رہے۔''

اس وقت میرا وجود سسکیوں سے ہچکولے کھا رہا تھا۔اور میں عرفات کے میدان میں اُس ڈوبتی شام کو اپنی کمر کے ساتھ ٹکی دیوار سے سر کو ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش کر دینا چاہتی تھی کہ اوپر والا جان لے کہ اُسے میرے گھر میں آنا ہے۔

سُنے اور پڑھے ہوئے میں اگر مشاہدے اور ذات کے تجربے کی شمولیت نہ ہو تو بات ہی نہیں بنتی۔مزدلفہ میں یہی ہوا۔کھُلے آسمان تلے تاروں کی چھاؤں اور ٹھنڈی تیز ہواؤں کے جھلار میں ''ارے بھئی مزدلفہ کے لیے ہلکی ہو کر جانا۔بس ایک جرسی شال اور چٹائی کافی ہے۔''

جی چاہتا تھا اپنی کزن کو جا کر جوتیاں لگاؤں۔کمبخت مروا دیا نا۔منیٰ سے چھوٹا سا روئی والا گدیلہ اُٹھا کر لایا جا سکتا تھا۔رڑے میدان میں چٹائیوں پر مغرب اور عشاء کی نمازیں ملا کر پڑھنے کے بعد وجود کو سکیڑ کر بیٹھ گئے۔نہ کھانے کا کچھ پتہ نہ چائے کے ایک گھونٹ کی دستیابی کا علم نہ باتھ روموں کے بارے میں کوئی معلومات۔

ہمارے سامنے والی جگہ پر اونچے لمبے مردوں کا ایک خاندان آ کر فروکش ہوا۔ پجارو گاڑی سے میٹرس، کمبل اور تکیے اُترے۔سٹوو جلے۔کمبلوں کی بُکلوں میں گرما گرم کھانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو خوشبوئیں گویا چہار سو پھیل گئیں۔اپنی بے سروسامانی پر بڑا رحم آیا۔میاں لوگ ساتھ تھے وگرنہ میں نے تو کاسہ گدائی میں کچھ ڈلوا ہی لانا تھا۔

یہ رات عبادت اور دعائیں مانگنے کی ہے۔عفت سے تازہ تازہ سُنی ہوئی بات یاد آئی۔میں نے اوپر دیکھا تاروں سے بھی پرے۔نفی میں سر ہلایا۔

''میری جان تم دیکھ رہے ہو نا۔میں تو کچھ نہیں کر سکتی۔پیٹ میں ہاہا کار مچی ہوئی

ہے۔ چائے کی طلب میں سر پھٹا جا رہا ہے۔ اور ٹھنڈ نے گٹے گوڈے منجمند کر دیئے ہیں۔''

میاں کہیں سے بٹتے چاول لے کر آئے تھے۔ ایسے بدمزہ سے چند لقمے ہی زہر مار کیے۔ پھر حاجت نے دباؤ ڈالا۔

''ہائے اِس مصیبت کو بھی آنے کی سوجھی۔''

گٹھڑی نے قہر درویش بر جان درویش کے مصداق حرکت کی۔ کہیں چڑھائیوں کے بعد باتھ روم تھے۔ چلو دو کام ہوئے نیچے سڑک پر مُفت میں تقسیم ہوتا قہوہ مل گیا۔ بکرے کی سالم سریوں میں پکے ہوئے چاول بھی مل رہے تھے۔ پر ان کی تو صورت ہی دہلانے والی تھی۔ کھانے کا حوصلہ کہاں سے لاتے۔ جب واپسی ہوئی میاں اور بلوچ صاحب کنکریاں چُن رہے تھے۔

''یہ اتنے بڑے بڑے پتھر بے چارہ شیطان تو لہولہان ہو جائے گا۔ چنے کے برابر کنکر ہونے چاہئیں۔''

کہتے ہوئے میں نے میاں کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔

پھر میں خود اس میں جُتی۔ مطلوبہ سائز اور مطلوبہ تعداد کو تھیلی میں ڈال کر خود سے کہتے ہوئے سکھ کا سانس لیا۔

''چلو یہ بھی ایک کام تھا جو ختم ہوا۔''

شب کے دوسرے پہر ہم دونوں خواتین بس میں چلی گئیں۔ اندر نرم گرم سی حدت نے بڑی تسکین دی۔ عقبی نشستوں سے خراٹوں کی آوازیں چند لوگوں کی موجودگی کا بتاتی تھیں۔ ابھی اس لذت سے لُطف اندوز ہوتے چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک تیز سی سرگوشی نے جیسے دہلا کر رکھ دیا۔

''تم جیسی کے گھر میں کیا آنا کہ راہ چاہت کی ذرا سی سختی ذرا سی سردی برداشت

نہیں۔''

میں فوراً باہر نکل آئی۔ راہ سلوک راہ چاہت کی کڑی منزلوں کی مسافت مجھ جیسی گنہگار اور دُنیا دار کے مقدر میں کہاں۔ مناسکِ حج کی صحیح ادائیگی میں کسی کوتاہی کی چُبھن اس فرض کی تکمیل میں خلش کا باعث نہ بنے اور میرے اُوپر دَم کی گرفت لاگو نہ آئے۔ ابھی تو یہی اطمینان چاہیے۔

اور مزدلفہ میں کھلے آسمان تلے رات کا گزارنا مناسک کا اہم حصہ ہے۔

منٰی کے لیے فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے قبل روانگی ہوئی۔ یہ سولہ سترہ میل کا ٹوٹا دیوار چین بن گیا تھا۔ شاعر کا یہ مصرع "مدینے کی گلیوں میں قصداً بھٹک جائیں گے" یاد آیا۔ یہاں سڑکیں گلیاں مکے کی تھیں اور قصداً نہیں مجبوراً بھٹکنا جاری تھا۔ پیٹ خالی، معدہ خالی پر کتنی عجیب سی بات تھی۔ نہ گیس کے بگولے سر کو چڑھتے تھے، نہ تبخیر معدہ کی کوئی کیفیت پریشان کرتی تھی۔ نہ لبوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔

کُبری خالد پر جب رمی کے لیے اُتارا گیا۔ ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ اپنے خیمے میں پہنچ کر کسی سے اپنے بدرنگے سے بالوں کی ایک لٹ کٹوائی۔

ٹائلٹ کی پہلے دھلائی کی پھر نہائی کی۔ پاکی اور پلیتی کا تناسب اُوپر والے کے کھاتے میں ڈالا۔ اور طواف زیارت کے لیے بے چین ہوئی کہ ابھی مکہ چلا جائے۔ پر مردوں کا معاملہ اٹکا ہوا تھا۔ قربانی اور سر منڈائی۔

طواف زیارت اگلے دن پر ملتوی ہو گیا تھا۔ پر میری اور دُردانہ کی شام اس بے کلی اس اضطراب کی گھُمن گھیری میں گزر رہی تھی کہ حرم میں رش کی صورت کیسی ہوگی؟

نماز مغرب کے بعد مختلف گروپس کے مختلف خیموں میں اس جانکاری کے لیے کہ ہے کوئی جو کچھ بتا سکے کی بھاگ دوڑ میں لگ گئیں۔ صدآفرین اُس ان پڑھ عورت پر جس

نے اشارے سے مجھے پاس بُلا کر بٹھایا اور محبت کے رسیلے لہجے میں کہا۔

’’رش سے گھبراتی ہو۔ ارے میری بچی جم جم یہ رش ہووے۔ سو بسم اللہ یہ رش ہو۔ ست خیراں اس رش دیاں۔ اکھیاں ٹھنڈی ہوتی ہیں اس رش سے۔ بس دُعا یہ کرو کہ تمہارے لیے آسانیاں پیدا ہوں۔ عافیت اور سلامتی سے اِس رکن کو پورا کرو۔‘‘

بٹر بٹر اُس کا پُر نور سا چہرہ تکتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے میرے بوتھے پر زور کا جُوتا پڑا ہو۔ شرمندگی کے ڈھیروں پانی میں نہا گئی۔ اپنی تہی دامنی اور پلّے نہ سیر آٹا تے گوندی دا سنگھ پاٹا والی کیفیت کا احساس ہوا۔

بس تو تبھی یہ جان پائی کہ اُوپر والا مجھ جیسی کے گھر میں کیوں نہیں آتا۔

صبح پہلا کام رمی تھا۔ کُبری خالد پر کھڑے ہو کر میں نے انسانوں کا ایک سیلِ رواں دیکھا۔ انسان مذہب کے بارے میں کتنا Possessive ہے۔ دلیل اور منطق میں نہیں اُلجھتا۔ شاید اسی میں اس کی نجات اور بھلائی ہے۔

مکہ جانے کے لیے میں تو گورنمنٹ کی سواری کے حق میں تھی۔ بلوچ صاحب پیدل چلنے پر مُصر تھے۔ میاں چُپ چاپ سُن وٹا بنے کھڑے تھے۔ بلوچ صاحب نے قدم اُٹھائے۔ دردانہ نے مجبوراً تعاقب کیا۔ میاں بھی چل پڑے۔ میں پیدل چل کر اپنی توانائی ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھی پر مجبوراً پیدل چلنے کی کھیر کھا رہی تھی۔

تیسرا کلمہ ضرور میرے ہونٹوں پر تھا۔ پر جلنا کُڑھنا بھی جاری تھا۔ کاش کہیں اُس راہ سفر کو عشق کی گھاٹی بنا لیتی تو شاید آسانی ہو جاتی۔ جیسا میری کزن کوثر نے عزیزہ سے پیدل حرم تک کا دس کوس کا پینڈا اعبادت سمجھ کر کیا اور میرے لیے ڈھائی کوس لمبے پینڈے بن گئے تھے۔ جھوٹی عاشق تھی نا۔

جونہی حرم کے مینار نظر آئے۔ میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے کہ مجھے ابھی طواف

نہیں کرنا۔ آرام سے تازہ دم ہوکر اندر جاؤں گی۔

اور پھر وہ ہوا تھا جس کا ذکر باب کے آغاز میں ہوا ہے۔قریب سے گزرنے والے ایک سادہ لوح پاکستانی نوجوان کی توبہ تلا کرتی زبان''اوے خالاں جی تے خالو جی ایہہ تے رب سوہنے دا گھر ایتھے نہیں جی کوئی شڑائی''(یعنی خالہ جی اور خالو جی یہ پیارے رب کا گھر ہے۔ یہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہونا چاہیے)۔

سچی اب ڈوب مرنے والی بات ہی تھی نا کہ کل کا چھوکرہ بڈھے لٹھوں کو عقل دے رہا تھا۔شرمندہ سی ہوکر میں جب بابِ اجیاد کی طرف بڑھی۔میاں نے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور صُلح جو انداز میں کہا۔

''کیا تھا ٹیکسی میں آجاتے۔سو ریال لے لیتا۔ دوسو لے لیتا۔ پیسہ کس لیے؟ بندے کے آرام اور سہولت کے لیے۔''

میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ جانتی تھی کہ وہ غصیلا ہے تو خر چیلا بھی ہے۔اُس کی انگلیوں میں موریاں نہیں مورے ہیں۔تاہم میں نے دل میں ضرور کہا۔

''ہائے میاں بیوی کے رشتے سے بڑھ کر دنیا میں شاید ہی کوئی بے غیرتی کا رشتہ ہو۔ یہ کسی غریب کاشت کار کی بیلوں کی اس جوڑی کی طرح ہے جو اکٹھے زمین کا سینہ چیرتے سہاگہ اور کراہی کے عمل کو سرانجام دیتے ہیں لڑتے مرتے بھی اکٹھے ہیں۔ اور پھر ایک ہی کھُرلی پر پٹھے (چارہ) کھانا بھی اُن کا مقدر ہے۔''

ہاتھ ضرور میرے ہاتھ میں تھا پر جیسے میں پژمردگی کے بھاری پتھروں تلے دبی ہوئی تھی۔ سیاہ لبادے میں لپٹے اُس کوٹھے نے جیسے دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔جھڑی شروع ہوگئی تھی۔ جی چاہتا تھا ہاتھ چھڑا کر بھاگ جاؤں اور لوگوں کے سروں پر سے تیرتی ہوئی غلاف سے جھول جاؤں۔ دیواروں سے لپٹ جاؤں۔ اتنا روؤں کہ پورے

حرم کو بھگو دوں۔

باب عبدالعزیز کے اندرونی صحن میں اُترنے والی سیڑھیوں کے پوڈے پر کھڑے ہو کر میں نے سامنے دیکھتے ہوئے بھیگی آنکھوں کو ہاتھ کی بیرونی پشت سے صاف کرتے ہوئے دائروں میں دیوانہ وار رقصاں لوگوں پر نظر ڈالی۔ کیفیت کچھ ایسی ہی تھی کہ تھالی گرے اور سروں پر ہی رہے۔

اُسے آواز دی اور اندر داخل ہوگئی۔ تین بار ہجوم میں پھنسی اور بس جیسے کسی غیر مرئی قوت نے باہر نکالا۔ دوبار میاں نے ڈپٹ کر کہا۔

''یہاں ہاتھ کیوں لہرانے لگتی ہو۔''

طواف تو کیا پر جیسے بے سوادا سا۔ دل کی کلی مرجھائی مرجھائی سی رہی۔ نفل پڑھے۔ آب زم زم پیا۔ ظہر کی نماز کے وقت ادائیگی کی صورت کچھ ایسی ہی تھی کہ سیڑھیوں کے ایک کونے پر بیٹھی تھی۔ ایک بازو کسی سینی گال کے حبشی کی گود میں تھا دوسرا بازو تیونس کے ایک بوڑھے کی چھاتی کو چھو رہا تھا۔ نہ یہ پتہ تھا کہ رکعت پہلی جا رہی ہے یا دوسری۔ پر یہ میری نماز عشق تھی۔ آنکھیں سیاہ غلاف کو تکے جاتی تھیں اور دل اُس سے ہم کلام تھا۔

میاں مجھے یہاں بٹھا کر کسی اور جگہ نماز پڑھنے چلا گیا تھا۔

سعی کی ادائیگی کے بعد۔۔۔ کیسے میرا جی چاہا تھا کہ ہم کہیں بیٹھیں۔ کچھ کھائیں پئیں۔

پر میاں کو اپنی جوتیوں کی فکر تھی۔ جہاں رکھی تھیں وہ دروازہ کہیں بہت پیچھے تھا اور ہم کہیں اور نکل آئے تھے۔ اب میں مُصر کہ کسی اور کی پہن لو۔ پر وہاں میرے سو اصرار پر ایک پکا انکار۔ پھر میں نے بھی جل کر دل میں کہا۔

''دفع ہو جاؤ بھگتو پھر۔''

ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر میں نے ٹانگیں پساریں اور لبن (لسی) کا پیکٹ منہ سے لگایا جو میں ابھی ابھی قریبی سٹال سے لائی تھی۔ دیر بعد میاں خالی ہاتھ وارد ہوئے۔ اب دُکانوں کا طواف شروع ہوا۔ وہاں کوئی پسند نہ آئی۔ گری پڑی ایک جوتی پہن کر ٹیکسی میں بیٹھے اور منیٰ آئے۔

چار بجے چل کر جب آٹھ بجے منیٰ پہنچے تو ہم احمقوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اُترنا کہاں ہے؟

کُبری خالد یا کُبری عبدالعزیز۔ رات خنکی میں بھیگی ہوئی۔ تھکاوٹ سے جسم چور۔ گلے میں پڑے شناخت کے نشان جگہ جگہ کھڑے شُرطوں کو دکھاتے۔ ایسے نالائق اور بونگے فٹ بال کے گیند کیطرح اِدھر اُدھر کی گلیوں میں لڑھکاتے پھرے۔ دس بج گئے تھے۔

کس قدر نالائق لوگ ہیں۔ حیرت تھی یہ کن شہ زوروں جواں ہمت اور دلیروں کا ورثہ ہیں جنہوں نے چاروں وانگ شجاعت کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔

مشکل وہاں مقیم چند پاکستانی نوجوانوں نے ہی حل کی۔ خیمے میں داخل ہونے سے قبل ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ دبایا اور کہا۔

''بڑی سُبکی کی بات ہے۔ مسٹر و مسز بلوچ کے سامنے بھاپ بھی نہیں نکالنی کہ بھول گئے تھے۔''

طواف وداع میں نے اکیلے کیا۔ اپنے رانجھے کو گیتوں سے لُبھایا۔ دائرے میں داخل ہوئی تو شیخ سعدی کی مناجات 'تو نمائندہ فضلی تو سزاوار خدائی' کہیں ہواؤں کے دوش پر لہراتی سماعتوں سے آٹکرائی۔

بس تو اسے اونچے اونچے گایا۔ سزاوار خدائی کی تکرار ہوئی۔ پھر وے چن میرے

مکھناں تے اک پل ایدھر تکنا' لبوں پر آ گیا۔ ' تے اک پل ایدھر تکنا' نہ دائیں طرف کا ہوش نہ بائیں جانب کا۔ سامنے نیلے آسمان کی وسعتیں تھیں۔ اور میں اُسے اپنی طرف تکنے کی دعوت دیتی تھی۔ ماہیا گایا۔ پیا پیا کا راگ آلاپا۔ سجناں وے سوہنیا۔ وے میرے شہزادیا۔

وہ تھا اور میں تھی اور میرے آنسو تھے۔ ساتویں چکر پر جب میں باہر آ گئی میں نے اُس مقام دلربا کو دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا سر کیف و سرور میں ڈوبا اور میری روح لطف و سرشاری میں نہا رہی تھی۔

تب دھیرے سے بھیگی آنکھیں کھول کر میں نے آسمان کو تکتے ہوئے کہا۔

''شکریہ اے پیار تیرا شکریہ۔''

☆☆☆

سفرِ اسپین

باب نمبر:1　　　تین چوہیاں میڈرڈ کے لیے نکلیں

- میڈرڈ کے viena ہوٹل کے لاؤنج میں ہمارا حال سر منڈاتے ہی اولے پڑے جیسا تھا۔
- بڑی ہی غم انگیز ہے داستان سپین جانے کی۔
- وہیل چیئر پر بیٹھ کر سرِ عام خود پر بڑھاپے کی سکہ بند مہر کا ٹھپہ لگوانا کچھ دل کو نہ بھایا۔

طمانیت سے بھرا پُر ابڑا لمبا سانس تھا جو ہمارے سینوں سے نکلا تھا۔ بلند و بالا اور خوبصورت سیاہ آہنی جنگلوں سے سجی بالکونیوں والی عمارتیں جن کے قدموں میں بچھی اودے رنگی پتھروں والی گلی لشکارے مارتی تھی اور جنہیں ہماری مسافر آنکھوں نے ستائش سے دیکھا تھا۔

میڈرڈ کے جس ہوٹل کے سامنے ہمارا خیر سے ڈولا اُترا تھا وہ Viena تھا۔ Alvarez Mendizabal لین میں واقع جس کی شان و شوکت کو ہمارے دل نے سراہتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے یہ تو ہماری توقع سے بھی بڑھ کر ہے۔ بڑا شان دار سا اور گلی بھی بڑی من موہنی سی ہے۔''

سو ٹیکسی والے کو فارغ کیا۔ اٹیچی کیس گھسیٹے گئے۔ شیشے کے خودکار دروازوں نے یکے بعد دیگرے کُھل کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''آیئے آیئے مہارانیوں آپ کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔''

جولڑکا کاؤنٹر پر کھڑا تھا وہ نرا انڈین اداکار ششی کپور کا چھوٹا بھائی دِکھتا تھا۔ بس فرق دو رنگے بالوں کا تھا جو اس کے سر پر نفاست سے جمے ہوئے تھے۔ جس نے ہمارے ہاتھوں سے ریزرویشن لیٹر پکڑتے، کمپیوٹر سکرین پر نظریں جماتے اور پھر اپنی چمکدار آنکھیں اٹھاتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''آپ کی ریزرویشن تو سولہ نومبر کی ہے۔''

''سولہ نومبر۔''

سیما چلائی تھی۔ ''اُلو کا پٹھا۔ عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے شاید اس کی۔''

پھٹکار تو یہ ہماری مادری زبان میں ہو رہی تھی۔ مگر وہ جوان تھا تو کیا؟ طوائف کی طرح ہر روز رنگ رنگ کے لوگوں کو برتتا تھا۔ فوراً سمجھ گیا۔ جھٹ سے فٹ سے ہمارا کاغذ ہمارے منہ پر مارتے ہوئے بولا۔

''یہ دیکھ لیں۔ کچھ غلط کہہ رہا ہوں میں۔''

اب جو آنکھیں پھاڑیں تو سولہ نومبر کسی دہکتے آگ اگلتے پہاڑ کی مانند نظر آیا تھا۔ جس سے نکلتے آتشی لاوے کے ذرے بھاگ بھاگ کر دوڑ دوڑ کر ہمیں اپنی بارش میں نہلانے لگے تھے۔ ہونٹ خشک، چہرہ بدحواس اور سارے جسم کا خون سر کی جانب دوڑتا محسوس ہوا۔

''پانی پانی۔''

دائیں دیکھا، بائیں دیکھا۔ ذرا دور میز پر دھرا پانی سے بھرا ڈھنپا جگ اور گلاس ٹرے میں دھرے نظر پڑے۔ دھڑ کی لگائی۔ تین گلاس پی کر حواس ذرا بحال ہوئے تو موبائل پر اپنے ایجنٹ سے بات کرنی چاہی۔ دو دن پہلے کے سیکھے ہوئے وائی فائی کے طریقہ کار نے

بڑا کام کر دکھایا تھا۔لڑکے نے پن کوڈ کا اندراج کیا اور سجاد سے بات کروائی۔

بادلوں کی طرح برسنے ورسنے اور کڑکنے سے اجتناب کیا۔مصلحت کوشی کا راستہ اپنایا۔گھنٹے بھر کی بک بک جھک جھک والی تگ ودو کا نتیجہ یہ تھا کہ لڑکا صرف اُس دن کی بکنگ کے لیے راضی ہوا کہ ایک کمرہ خالی تھا۔مگر اگلے دن کے لیے یکسر منکر کہ بکنگ شیڈول ہاؤس فل کا اعلان کرتا تھا۔

چلو خیر۔ہم نے بھی اپنے جذبہ ایمانی کو للکارا۔آج کی روٹی ہے تو کل کا اللہ بیلی۔مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔مگر بات یہاں تک جا کر بھی حل ہونے میں نہ آرہی تھی کہ اس کا تقاضا تھا کہ ادائیگی تو صرف کریڈٹ کارڈ سے ہوگی۔

اب لاکھ سر کھپا رہے ہیں کہ یہ جو بدحواس اڑی اڑی رنگت والی تین عورتیں تم دیکھ رہے ہو قطعی کوئی ٹُٹی پنجّھی فقیر فقری قسم کی نہیں ہیں۔تمہارے رائج الوقت سکے کا خاصا زادِراہ لے کر آئی ہیں۔گُتھلی کا منہ کھلے گا تو ڈھیر لگ جائے گا۔مگر اُس اُلٹی کھوپڑی والے کو سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔ایک ہی رٹ تھی۔کریڈٹ کارڈ نکالو۔

اب خود کو وہی کہنا لازم ٹھہرا تھا نا۔بڑی پڑھی لکھی دنیا گھومنے والیاں۔رہیں گی وہی اُوت کی اُوت۔

اب اس سے بھی بڑا اُوت ہونے کا اور ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ کسی ایک نے کاغذ کھول کر پڑھنے کی تکلیف نہیں کی۔یوں کہنے کو ہم بڑی ہوشیار بنتی اور ظاہر کرتی ہیں۔

اپنے باس سے بات کراؤ۔مسکینی سے کہا۔

بہرحال اُس نے خود ہی کسی سے گٹ پٹ کی۔121 یورو اور سوڈ الرضمانتی ٹکہ کہ ہماری کسی قسم کی کسی بھی چیز سے دھینگا مشتی کی صورت میں ہرجانے کی صورت کٹوتی ہو سکے۔

چلو خدا کا شکر شکر کرتے سامان اٹھایا کہ اب میڈرڈ کی اِس سنسان سی گلی سے سامان اٹھا کر کہاں دھکے کھاتے پھرتے۔ آج تو کٹے کل کا اللہ بیلی۔ وہ توکلّ جو درویشوں کی میراث ہوتا ہے اس کا معمول کی طرح زبانی کلامی مظاہرہ کرتے ہوئے بار بار کہا۔

''اللہ مسبب اسباب ہے۔'' مگر لگتا تھا یہ اظہار یہ روح سے خالی تھا کہ اضطراب اور بے چینی کے حملے بیکل کرتے تھے۔ باہر نکلنے، کہیں گھومنے رات کا کھانا کھانے یا کچھ دیکھنے کا تو ہوش ہی نہ تھا۔

سجاد کا تقریباً بارہ بجے کا آخری پیغام مایوسی سے بھرا ہوا تھا۔

تکیئے پر سر رکھتے ہوئے میں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں موند لیں اور خود سے پوچھا کہ یہ سب پریشانیاں کیا ہماری نالائقیوں یا ہماری فضول سی اناؤں کا نتیجہ تھیں۔

سچی بات ہے سپین جانے اور اُندلیسیہ کو دیکھنا سالوں پرانا خواب تھا۔ نہ صرف میرا بلکہ میرے خیال میں ہر لکھنے والے کا خواب ہے۔ خواب کو تعبیر ملنے کا وقت آیا تو ساتھیوں کے ناموں پر غور و خوض شروع ہوا۔

ہماری بہت پیاری دوست بڑی وڈی جاگیردارنی بُشریٰ اعجاز بھی سپین کے لیئے مری جاتی تھی۔

''دیکھو جب بھی وہاں جانے کا ارادہ کرو۔ مجھے نہیں بھولنا۔ بہت بار کا یہ تکراری جملہ سب سے پہلے یاد آیا۔ سوچا فون کروں۔ ہندسے ابھی 0300 تک ہی دبے تھے کہ آگے بڑھنے کی بجائے رُک گئی۔ سوچ نے کچھ کہا تھا۔

''اری اومُور کھ رُک جا۔ جذباتی مت بن۔ بُشریٰ بہت رکھ رکھاؤ اور لیئے دیئے والی ہے۔ سفر وہ بھی بیرون ملک کا، اس پر طرّہ ذاتی اور مہار بھی تم جیسی کوڑھی جدید ٹیکنالوجی سے بے بہرہ اور قدرے صوم رن کے ہاتھ میں۔ کہیں اونچ نیچ ہوگئی تو؟ بڑا سا سوالیہ نشان

سامنے تھا۔

''ارے تم ٹپر واسنی کا کیا ہے؟ اپنی ننھی مُنی سی دو جوڑوں والی بُقچی سر ہانے رکھ کر کہیں کسی پھٹے، بینچ اور فرش پر بھی سو جاؤ گی۔ پر وہ تو پکی پکی ڈیرے دارنی ہے۔

اب دل سے ہوک سی اٹھی۔ مگر ہائے بشریٰ میری سویٹ ہارٹ بہت پیاری لگتی ہے وہ مجھے۔ جب سپین جانے کا سُنے گی تو گلہ شکوہ نہیں باقاعدہ ناراضگی کا اظہار ہوگا۔

نہیں نہیں بھئی اِس کرشماتی محبت کو آزمائش میں نہیں ڈالنا مجھے۔ سخی نالے صوم بھلا جھیڑا اترت دیوے جواب۔

چلو بُشریٰ تو پاسے لگی۔

یوں کہنے کو سیما بھی پوری بیگم ہے۔ مگر پکی گوڑی سہیلی ہے۔ کچھ سفر ساتھ کر بیٹھی ہے مزاج آشنا ہے۔ قہر درویش بر جان درویش والا کام کر لیتی ہے۔ خلاف مزاج بات پر منہ پھلائے تو کچھ دیر بعد نارمل بھی ہو جاتی ہے۔ سُناتی ہے تو دس سُن بھی لیتی ہے۔

نعیم فاطمہ علوی بہت خوبصورت افسانہ نگار اسلام آبادی اُدھیڑ عمر کی خاتون پارے کی طرح متحرک، گھر میں ٹکنا محال۔ بچوں کی ذمہ داریوں سے فارغ لائق فائق شوہر ڈاکٹر ایوب علوی جیسے فرض شناس اور ذمہ دار آفسر کو Fast یونیورسٹی کے حوالے کرتے ہوئے خود سارا دن تتلی کی طرح اڑتی پھرتی کبھی موسیقی کے پھولوں پر بیٹھتی، کبھی رفاعی اداروں کے پھولوں جیسے بچوں کی دلداری کرتی اور کبھی قیصرہ علوی کی سنگت میں اسلام آباد کی خواتین کی محفلیں منعقد کروانے جیسے شغل میں جی جان سے مصروف رہتی ہے۔ سیر سپاٹے کی دلدادہ کئی بار ساتھ جانے کا اظہار کر بیٹھی تھی۔

اب فون کھڑکاتی اور پوچھتی ہوں کہ تم ہم جیسی بڈھیوں کے ساتھ نباہ کر لوگی۔ کسی میوزیم، کسی محل، کسی لائبریری میں اگر تھک کر ہم بیٹھ جائیں تو تم اکیلے میلہ

گھوم لو گی۔ ڈر ور تو نہیں لگے گا اور ہمیں کوسو گی تو نہیں۔''

اس کا قطعیت سے بھرا پرا جواب سُننے کو ملا۔

''کوسنے والا کام تو شاید منہ پر نہ کروں ہاں اندر خانے تو ہو گا۔فرشتہ تھوڑی ہوں انسان ہوں۔ بندہ پیسہ بھی اُجاڑے اور پیاس بھی نہ بُجھے۔اور ہاں یہ اکیلے میلہ گھومنے والی بات قبول نہیں۔''

''تو بس پھر بیٹھو آرام سے اور انتظار کرو منیرہ شمیم کی فراغت کا۔تمہاری تیز رفتاری کا وہی ساتھ دے سکتی ہے۔ بیبا میں کا ہے کو نکو بنوں۔''

تو چلو نعیم فاطمہ کا پتہ بھی کٹا۔

نیلما ناہید درانی سے بات کرلو۔ وہ بڑی خواہش مند تھی۔ سیما نے کہا۔ دراصل چار کا ٹولہ بڑا سستا پڑتا ہے۔

ذہنوں میں یہ بات تو تھی مگر نہ بابا نہ طویل سوچ بچار کے بعد خود سے کہا۔ پیاری دوست ہے مگر پولیس والی ہے۔ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہونے والی۔ پولیس کا تو سب انسپکٹر نہیں مان۔ وہ تو ایس پی رہی ہے۔حکم چلانے والی۔جلوے دیکھے ہیں میں نے اس کے۔کھڑے کھلوتے ٹانگ دیتی ہے بندے کو۔ ہائے کہیں کوئی غلطی ولطی ہوگئی تو مار صلواتوں سے حشر نشر ہو جائے گا۔

اب رہی نیلم احمد بشیر یار غار بے تکلف اور مزاج کی مکمل ہم آہنگیت والی۔ چار سُن لو دس سُنا دو۔کوئی بات ہی نہیں۔مگر اس وقت وڑ وے جیا تے نکل وے جیا جیسی کیفیت میں تھی۔اس کے ہاں ویزہ کا تو کوئی مسلہ نہ تھا۔مگر بہت سے اور مسائل اس نے جان کے ساتھ چمٹائے ہوئے تھے۔ بیٹی داماد نے امریکہ سے آنا ہے گھر کی صفائی کروانی ہے۔صوفے قالین بدلنے ہیں۔ داماد بڑا رکھ رکھاؤ اور سلیقے والا بندہ ہے۔ ہاں دیکھو نا اگر

میں تمہیں غرناطہ آن ملوں تو کیا کوئی فلائٹ سیدھی مجھے مل سکتی ہے؟

مگر سُنو پہلی بات تمہاری نیند کا مسئلہ کسی فضول نک چڑھی محبوبہ کا سا ہے جسے لتروں کی ضرورت ہوتی ہے۔الگ کمرہ تمہاری کہیں بھی جانے کے لئیے پہلی شرط ہے۔تو بھئی پورے کمرے کا کرایہ تم نے خود بھرنا ہے۔شئیر کے لئیے ہماری معذرت۔باقی رہا تمہارا مالیگا سے ہمیں غرناطہ آملنا جو میرے خیال میں عملی طور پر مشکل ہے۔چلو اللہ خیر صلاّ۔

اب یہ تین چوہیاں گھر سے نکلیں۔فارم ہاتھوں میں تھامے بخاری ٹریولرز کے پاس جا پہنچیں کہ بالعموم ٹکٹ ان سے ہی لیتی ہوں۔پاسپورٹ کاونٹر پر بیٹھی لڑکی کو تھمائے تو اس نے میرا پاسپورٹ تو میرے منہ پر مارتے ہوئے کہا۔

''پاسپورٹ کو تو دیکھنا تھا۔ایکسپائر ہو گیا ہے۔''

میں نے بھونچکی سی ہو کر بے اعتباری سے اسے دیکھا اور جھپٹنے کے سے انداز میں اُس سے گویا چھینا۔اب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوں۔

''لو کرلو گل۔بی بی بیگم چلی ہیں سپین اور جانتی ہی نہیں کہ خیر سے یہ مدت پوری کیئے بیٹھا ہے۔''

بحر حال ارجنٹ کا راستہ کھلا تھا۔چلو کاغذات کی خانہ پُری،ٹکٹ اور میڈرڈ کے لئے فرضی ہوٹل کوئی نو ہزار روپوں کے عوض سارے بکھیڑوں سے نپٹ نپٹا کر فیڈ یکس کی راہ پکڑی۔

فیڈ یکس کے باہر کھڑے گارڈوں نے ہم تینوں کو اندر داخل ہونے کی کوشش پر ایک زبردست قسم کی لتاڑ دی۔

''منہ اٹھائے چلی جا رہی ہیں۔جانا کہاں ہے؟''

جی چاہا ایک جھانپڑ لگاؤں۔ دیکھو تو زرا یہ سیکورٹی گارڈز ہی نہں مان۔ تاہم غصے پر قابو پایا اور نرمی سے کہا۔

''سپین ایمبیسی''

''فیڈ ایکس اُسے اب ڈیل نہیں کر رہا ہے۔'' ٹکا سا جواب تھا۔

تو کہاں جائیں کاغذات جمع کروانے ہیں۔

''ہمیں کیا پتہ'' بظاہر تو یہ کہا گیا مگر خدا شاہد ہے بوتھوں پر صاف لکھا تھا۔ جہنم میں جاؤ پر ہمارا بھیجا مت چاٹو۔''

اب پوچھتے پھر رہے ہیں۔ بلا آخر کسی نے ترس کھا کر کہا۔ ٹی سی ایس گلبرگ برانچ حجاز اسپتال کے پاس والی نے ٹھیکہ لے لیا ہے۔

مار دھاڑ کرتے وہاں پہنچے۔ ریشپن پر ہی اتنی ساری شرطیں بتا دی گئیں کہ لرزہ سا طاری ہو گیا۔

''ارے دفع کرو۔ ہمارے نصیب میں وہاں جانا نہیں۔

اب غم غلط کرنے بمبئی چوپاٹی آ گئے۔ خوب ٹھونسا ٹھنسائی ہوئی۔ دفعتاً سیما نے اپنے داماد شوکت نیازی کو اس نئی افتاد سے آگاہ کیا کہ وہ بلجیئیم ایمبسی میں پریس ایڈوائز تھا۔ شوکت نے مجھے ہدایات دینی شروع کر دیں۔

''ارے بیا مت بتاؤ مجھے میری بُھس بھری کھوپڑی میں کچھ نہیں آنا۔ صُبح میرے کمپوزر کو بتانا۔ اس کے پلّے کچھ پڑ گیا تو دیکھیں گے۔''

مگر ہوا یہ کہ سیما کے نواسے نے رات کو نانی اور نانی کی سہیلیوں کے کوائف ٹی سی ایس کی ہدایات کے مطابق انہیں بھیج دیئے۔ چار دن بعد کا وقت ملا۔ سیما کے انٹرویو کا ٹائم ڈیڑھ بجے، میرا دو اور مہر النساء کی حاضری ڈھائی بجے۔

چلو خیر مطلوبہ دن مار دھاڑ کرتی تین بڑھیاں ایک بجے ہی دفتر پہنچ گئیں۔ اب پتہ چلا کہ سب کاروباری شوبازیاں اور ہتھکنڈے ہیں۔ خیر سے ڈیڑھ بجے تینوں کو اندر دھکیل دیا گیا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے لڑکے نے باری باری کاغذات چیک کیئے۔ کِس فارم میں کیا چیز نہیں لگی۔ کون سا اندراج درست نہیں۔ اب فلیوڈ لگا۔ درستگی ہوئی۔ مہرانساء تصویریں گھر بھول آئی تھی۔ اُسے دوڑایا۔ نظریں گھڑی کی سوئیوں پر کہ وقت ختم ہونے سے قبل آج یہ پلندوں کا سیاپا آر پار لگ جائے۔ چلو شکر فیس جمع ہوئی اور سُکھ کا سانس بھرا۔

اب امید وبیم کے اِن دنوں میں جب جب طبیعت کا کہیں اُتار چڑھاؤ ہو جاتا تو ایسے میں گلے شکووں کا پٹارہ کھل جاتا۔ بھلا جب جوانی تھی دس کوس کا پینڈا کرنے کی ہمت تھی تب تو نے وہاں جانا مقدر کیوں نہ کیا۔ پھر جذبائیت عود آتی۔ منا ڈے یاد آتا۔ اس کا گانا سُننا معمول بن گیا۔

تو پیار کا ساگر ہے تیری اک بوند کے پیاسے ہم
گھائل من کا پاگل پنچھی اڑنے کو بے قرار
پنکھ ہیں کومل آنکھ ہے دُھندلی ہے
جانا ہے ساگر پار
اب تو ہی اسے سمجھا

جیسے ندی میں باڑ آجائے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگتے۔ ہر مصرع خود پر لاگو کرتی۔ سدا کا پاگل من۔ اُڑنے کو تو ہمہ وقت بے قرار ہی رہتا ہے۔ حالت بھی اب گھائل سی ہے۔ اور جانے کی دیوانگی بھی ساگر پار کی ہے۔ تو اب تیرے سوا ہے کون جو اس کا ہاتھ پکڑے گا۔

تو ویزے کی منظوری ہوگئی اور نئے بکھیڑے شروع۔

سرفہرست ہوٹل کی کھوج کہ ٹکٹ ایجنٹ نے ویزے کے لئیے محض خانہ پُری کی تھی۔لاس ویگاس ایک طرح ہوسٹل ڈارمیٹری ٹائپ کا تھا جہاں اوپر تلے بیڈوں کا سلسلہ تھا جن تک رسائی سیڑھی کے ذریعہ تھی۔اب ہم گئیے گوڈوں کے عارضوں میں مبتلا یہ بندروں والی اچھل کود کرنے سے تو رہیں۔سوانٹرنیٹ پر خود بھی کچھ ٹامک ٹوئیاں مارنے لگے کہ جب ٹکٹ ایجنٹ کے پاس جائیں تو الّو کی پٹھیاں نہ لگیں۔

تاہم پہلا رولا اس وقت پڑا جب پچاسی ہزار کا ٹکٹ ایک ہی اڑان میں اٹھانوے ہزار کا ہوگیا۔اب تکرار کیوں کیسے اور کوئی بات ہے بھلا جیسے نوکیلے اعتراضات سے ہوئی۔جواب آیا۔ایرلائنوں پر رش ہے۔

’’لو اکتوبر کا وسط گزر گیا ہے۔آف سیزن شروع۔رش کہاں سے آ گیا؟

اس ٹیلی فونک سلسلے میں بخاری والوں پر دو حرف لعنت کے بھیجنے سے پہلے تینوں عورتوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ خیر سے پہلے دائیں بائیں کی خبر تو لے لو۔مہرالنساء نے فوراً اسلم مکرّم کا نام لیا۔ان کے ذریعے ہم ازبکستان گئے تھے۔جسے میں نے ردّ کرتے ہوئے رائے دی کہ وہ صرف وسط ایشیا کے ممالک کو ڈیل کرتے ہیں۔یورپ کے لئیے دلاّلی کریں گے اور ہمیں دوہرا رگڑا لگے گا۔

سیما نے اپنے ایجنٹ کے پاس چلنے کا کہا۔بیچ میں نیلم احمد بشیر کودی۔’’ارے میرے ایجنٹ کے پاس چلو۔‘‘ ساتھ تعریفوں کے ڈھیر بھی لگ گئے۔

بظاہر نیلم ہمارے ساتھ جا نہیں رہی تھی۔مگر چونکہ ہمارا ہگلنا مُوتر نا سب ایک دوسرے کے صلاح مشورے سے ہوتا ہے۔اس لئیے روزمرہ کی ہر رپورٹ سے باخبر ہونا اس کے لئیے کھانے پینے کی طرح ضروری تھا۔ساتھ ساتھ مشورے،تبصرے اور نکتہ چینیوں کا عمل بھی جاری ساری تھا۔سیما نے نواسے علی کو بھی بیچ میں لے لیا تھا۔نئے زمانے کا بچہ جس کی

نیٹ سے حاصل کردہ معلومات پر سیما اپنا رعب جماتی تھی۔ میرا بھتیجا عبدالمالک بھی اپنی خدمات بمعہ کریڈٹ کارڈ کے ہمارے معاملات میں گھسڑا پڑا تھا۔ سب کی اپنی اپنی بولیاں تھیں۔

غرناطہ کی بکنگ میں نے اپنی مرضی سے کروالی اورالحمرا کا کیس بحث مباحثوں میں اُلجھ گیا۔ میں نے بھی دو حرف لعنت کے بھیجے کہ بھگتیں گی خود ہی۔ دراصل سیما پیچھے چلنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اور آگے چلنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مغربی یورپ کے بہت سے ملکوں کی سیاحت کئے ہوئے ہے مگر اس کے سارے سفر شوہر، بیٹیوں اور داماد کی چھتر چھاؤں میں تھے۔ جہاں آپ قوت فیصلہ کی طاقت سے محروم ہوتے ہیں۔ رہی میں تو میں کون سا کِسی قاعدے کُلیے میں تھی۔ ہمیشہ تو یہی چلن رہا کہ جب جی مچلا۔ خواہش نے شدت پکڑی۔ منہ اٹھایا اور اس کے توکل کے سہارے چل پڑی۔ سچی بات ہے وہ بھی اس بونگی سی عورت کے اعتماد کا ہمیشہ بھرم رکھتا تھا۔

چلو خیر نیلم کے ایجنٹ سجاد نے میڈرڈ میں ہوٹل کی بکنگ اور ٹرکش ایرلائن کا ٹکٹ وہی عین اٹھانوے ہزار میں بک کیا اور یوں یہ تین عورتیں سب چھوٹی موٹی تلخیاں اور شکوے شکائتیں بھول بھال کر مسکراتی ہنستی جہاز میں چڑھنے کے لیے منہ اندھیرے گھروں سے نکل پڑیں۔ کچھ جاگتے، کچھ سوتے ایرپورٹ پر لوڈنگ کے سارے دھندے نپٹا کر فجر کی نماز کی ادائیگی کی اور ہاتھ دُعا کے لیے اٹھائے تو ہتھیلیوں پر اپنے اپنے گھروں میں ہنستے بستے راضی خوشی بچے آ کر بیٹھ گئے۔ احسان مندی کے بھیگے جذبات سے اوپر والے کا شکریہ ادا کیا۔ اُن کے لیے مزید عافیت اور مزید کرم کی دعائیں مانگیں۔ عورت بھی کیا شے ہے۔ بچوں کے لیے ہی مری جاتی ہے چاہے جیسے بھی ہوں۔

صبح کاذب کی گود سے صبح صادق کے پھوٹتے منظر کو دیکھنا گو میری روز مرّہ زندگی

کا ایک حصّہ ہے کہ میرے کمرے کے شیشوں سے یہ منظر مجھے کہیں بگ بینگ کی یاد دلاتا ہے کہ بس ایک دھماکہ جب یہ دنیا گل وگلزار بن گئی۔کہیں مذہبی حوالے کہ کائنات کی تخلیق نے چھ دن لیے۔ چھ دن جو خلا کی تھیوری میں پل اور سیکنڈ کے زمرے میں آتے ہیں۔تاہم اس وقت یہ اپنی آفاقی وسعتوں کے ساتھ موہ لینے والے انداز میں سامنے تھا۔طلوع آفتاب کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے منظر بہت بار کی اِن سے آشنائی کے باوجود اِس وقت ہزار نئے رنگوں سے دل کے تاروں کو تخلیق کائنات کے والی سے جوڑ رہے تھے۔

جذب کی یہ کیفیات ناشتے کی ہلچل سے ٹوٹیں۔ٹرے پکڑے ہوئے بغور اُس دلبرسی میزبان کو دیکھا۔خوبصورت تھی مگر بائیں جانب کی دوسری لین میں ٹرالی گھسیٹتا سٹیورڈ بھی کچھ کم نہ تھا۔''ماشاءاللہ'' بے اختیار ہی ہونٹوں سے نکلا تھا۔

مزے کا ناشتہ،مزے کی چائے۔ پہلا پڑاؤ استنبول تھا۔آخر اپنے گھر تو انہیں ٹھہرنا ہی تھا۔راستے میں جو تھا۔بھئی لینڈنگ کے وقت یہ شہر جس انداز میں لمحہ بہ لمحہ سامنے آتا ہے اس کی مثال دینی مشکل ہے۔ سچی بات ہے آخر ہماری بھی زندگی گزر گئی ہے اِن اترنے اور چڑھنے کے تقابلی جائزوں میں۔

ایرپورٹ کی رنگ رنگیلی دنیا، دو گھنٹے کا قیام۔ہم نے کھانے پینے، ونڈو شاپنگ اور پروردگار کی بھانت بھانت کی مخلوق کو دیکھنے اور تبصرے کرنے جیسے دلچسپ شغل میں گزاری۔اوقات تو ہماری بالخصوص میری یہ تھی کہ ارمانی کے پرفیوم کی قیمت کا ہی سُن کر سانس سینے میں اٹک گیا۔

''بھئی آپ ہمیں کنجوسی منجوسی کے طعنے تو مت دیں۔ہم کیا کریں۔اپنی فطرت سے لڑ تو نہیں سکتے۔ بچے بھی جب ایسی چیزیں لاتے ہیں تو ماں کو دیتے ہوئے قیمت ڈیڑھ گنا گھٹا کر بتاتے ہیں کہ بیچاری ماں کو کہیں ہارٹ اٹیک ہی نہ ہو جائے۔

تازہ مالٹے اور پائن ایپل کے جوس کو پیئے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ طبیعت کچھ مزید کھانے پر مچلنے لگی تھی۔ دراصل ہم بھی کیا کرتے جگہ جگہ شوکیسوں میں سجی ون سونی چیزیں طبیعت للچاتی تھیں۔ نہ نام آتے تھے، نہ شکلوں سے شناسائی۔ بس آنکھوں کو بھلی لگتیں اور انگلیوں سے اشارے شروع ہو جاتے۔ پھر ایک عراقی خاتون سے ملاقات ہوئی۔ تعلق اور ناطہ عراق سے جوڑتی تھی۔ سیٹل امریکہ میں تھی۔ پہناوے اور ہلکی پھلکی جیولری نے حُسن دو آتشہ کر رکھا تھا۔ شُستہ الفاظ میں توپ قسم کی پراپرٹی ڈیلر تھی۔ عامیانہ زبان میں تگنی کا ناچ نچانے والی دلدلہ تھی۔ مسلمانیت کے حوالے سے کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت ہی نہیں کہ وسطِ ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کی لڑکیوں کو جن حال حلیوں میں دیکھا ہے۔ وہ ماشاءاللہ سے ہماری قلبی تسکین کے لیے ٹانک کا کام دیتا تھا۔

ہم بھی کیا شے ہیں چاہے ساری دنیا گھوم آئیں پر رہیں گے وہی اتوت کے اتوت ہی۔

ایرپورٹ کی رنگینیوں میں بھی یہی چنتا کہ کہیں جہاز ہی نہ چھوٹ جائے۔ بڑھے طوطے کی طرح خدا خدا کر کے فلائٹ بورڈ ہمیں پڑھنا آ گیا ہے۔ یہ بھی جانکاری ہو گئی ہے کہ خیر سے جہاز ہمارے بغیر نہیں اڑے گا۔ مگر کیا کریں خود پر اعتبار ہی نہیں۔ فقیروں کی طرح رُک رُک کر ''ذرا مائی نوں دس جاوے سوہنیا'' جیسی صدائیں لگانے کی عادت پڑ گئی ہے۔

ٹرمینل کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے تھا۔ وہیل چیئر کی سہولت کا ٹکٹ کے ساتھ لکھوایا ضرور تھا پر اس کے لیے کہنا یا تقاضا کرنا تینوں میں سے کسی کو یقیناً اچھا نہیں لگا ہوگا۔ دسروں کے دل کا کیا کہوں اپنی گواہی تو دے سکتی ہوں کہ اندر خانے نے ہرگز پسند نہیں کیا تھا کہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر بڑھاپے پر سکہ بندسی مہر لگواؤں۔

اوراب آٹے دال کا بھاؤ پتہ چل رہا تھا۔قریب سے گزرتی خالی وہیل چیئر کو دیکھ وہی حال ہوا تھا کہ جس کے لیے کہتے ہیں گڈی دیکھ کر پیر بھاری ہو گئے۔مزے سے چڑھ بیٹھی۔سیما نے حسرت سے دیکھا۔کہا کچھ نہیں۔خود ہی شرم آئی کہ وہ بے چاری دل کی مریض۔کچھ آگے جا کر اُسے بیٹھا دیا۔پر یہ بندہ کیسا بیبا نکلا۔کلیرنس سے لے کر بیک ڈور سے ہمیں لفٹ کے ذریعے سیدھا جہاز میں سوار کروا دیا۔واہ بھئی واہ موجیں ہو گئیں۔پل جھپکتے میں وی آئی پی سلوک مل گیا۔

کھانا مزے کا تھا اِس رغبت ،چاہت ،اطمینان اور سکون سے کبھی کھانا کھانا نصیب نہیں ہوا یا کہہ لیں کہ خود پر نصیب نہیں کیا۔دراصل میں دو گھنٹے کے اس سفر کے ہر ہر لمحے سے لُطف اٹھانا چاہتی تھی۔اُترے تو وہیل چیئر منتظر تھیں۔شاباش۔ترک بچے نے اگر آنکھ جھپکتے میں زمین سے اٹھا کر جہاز میں پہنچا دیا تو اسپینش پورٹروں نے بھی حق خدمت ادا کر دیا کہ ہمیں کرسیوں پر بٹھا اور کنویئر بیلٹ سے ہمارا سامان اُتروا ہمیں چیک آؤٹ کے مرحلوں سے گزار کر ٹیکسی میں لا بٹھایا۔منہ سے تو ذرا نہ پھوٹے پر کہیں آنکھوں میں خاموش سی التجا ضرور تھی۔

’’دے جاؤ کچھ۔اللہ بھلا کرے گا۔‘‘

شام کا حُسن سُورج کی سونے رنگی کرنوں میں غضب ڈھا رہا تھا۔ہواؤں کی شوخی ،عمارتوں کی بلندی اور سڑکوں کی فراخ دلی سب توجہ کھینچتے تھے۔

اب میڈرڈ پہنچ کر سجاد کے بک کردہ ہوٹل میں ہمارے ساتھ جو ہوا اس کی مختصراً تفصیل سے آپ آشنا ہو چکے ہیں۔

بھئی اب آپ سے کیا پردہ۔شیشوں سے باہر آسمان کو دیکھتے ہوئے میں نے کوئی پانچ بار تو شُکراً شُکراً کہا ہوگا۔احسان ہے مولا تیرا بُشریٰ اعجاز ساتھ نہیں تھی۔نیلما نہیں

تھی۔رہی نیلم پروہ ہوتی تو ایسا ہونا ہی کب تھا؟ کہ وہ آنکھوں پر چشمہ چڑھا کر تفصیلاً دیکھنے کی عادی ہے۔چلو لعنت بھیجو جو ہوا سو ہوا۔

رات تو بہرحال کٹ ہی گئی۔کچھ سوتے اور کچھ جاگتے۔صبح کی نماز،قبلہ کا تعین مہرالنساء نیچے جا کر پوچھنے کے لیے بے قرار۔میں نے لعن طعن کی۔

''اے باؤلی ہوگیا؟لڑکے کو چیچو کی ملیاں کا محمد رمضان سمجھا ہے تو نے۔یورپ کی جوان نسلیں مذہب سے فرنٹ ہوئی پڑی ہیں۔یوں اتفاقیہ کی فہرست میں آ بھی جائے تو رومن کیتھولک کا پیروکار ہوگا۔تیرے کعبے سے اُسے کیا سروکار۔سجدہ دے۔چاروں کھونٹ تیرے ہیں۔جو من کو بھائے اسی طرف جھک جا۔وہ تو کمرے میں بھرا پڑا ہے۔

اب تینوں عورتوں کے سجدے اُن کی من پسند اطراف میں تھے۔

ناشتے بارے پتہ چلا کہ چالیس یوروفی کس فی رات کا کرایہ بھر کر بھی ناشتہ نہیں ملے گا۔اگر طلب ہے تو نو یوروفی کس ادائیگی ہوگی۔مرتا کیا نہ کرتا۔رات کے بھوکے بے حال غریب الوطن۔''چلو چلو ناشتے کے لیے۔بھاڑ میں جائیں یورو۔مشترکہ صدا لگی۔

کوئی ڈائننگ ہال نہیں تھا۔وہی ویٹنگ لاؤنج اب کھانے کے کمرے میں بدل گیا تھا۔بڑی کاروباری ذہنیت ہے بھئی اِن اسپین والوں کی۔دودھ دہی تازہ اور ڈبے کا جوس۔

اب نو یورو میں دودھ بھی پیا۔دہی بھی کھالیا۔جوس پر زبان للچائی نہیں مگر 1133 روپوں کا احساس اُکسا رہا تھا کہ خیر صلاّ چڑھا جا گلاس رام بھلی کرے گا۔پس تو مُنے چُنے سے ایک چھوڑ دو گلاس چڑھا لیئے۔ساتھ میں دعا بھی کر لی۔اور تھوڑی سی خود کو لعن طعن بھی کہ کیا شوہدی عورت ہے چاہے نیم ترش پانی اندر دودھ کے ذخیرے کو ہی پُھٹکری پُھٹکری کردے۔پڑا کرے۔سردار جی کی طرح لمبا ڈکار مارا۔تینوں سکھیوں نے

اپنی اپنی گھتلیاں کھولیں۔کاؤنٹر پر جا کر ہر ایک نے دس دس یورو کا نوٹ دیا اور اپنی اپنی ریز گاری سنبھالی۔

اب کیا کرنا ہے؟ غرناطہ کے لیے ٹرین کی بکنگ کروانی ہے۔ ریلوے اسٹیشن جانا ہے پر پہلے اِس سیاپے سے تو نپٹ لیں۔کہیں نیا ٹھور ٹھکانا تو ڈھونڈ لیں۔

چلو شکر کاؤنٹر پر کھڑا منحوس مارا بدمزاج لڑکا غائب تھا۔یہ اب دو عورتوں کے قبضے میں تھا۔نوجوان اور اُدھیڑ عمر۔دونوں بڑی ہی معقول اور ہمدرد نظر آئیں۔ہماری مشکل سے آگاہ ہوچکی تھیں۔نیٹ پر آس پڑوس میں ہماری درخواست پر تا نکا جھانکی بھی کر بیٹھی تھیں۔اُن کے چہروں پر سجے نو NO کے پوسٹر ہمارے لئیے شدید پریشانی کا باعث تھے کہ دفعتاً سجاد کے فون نے سوکھے دھانوں میں پانی ڈال دیا کہ اس نے قریب ہی ہوٹل کی خوشخبری سُنا دی تھی۔Best Westren Hotel پتہ بھی سکرین پر چمک رہا تھا۔

چلو ٹیکسی منگوائی اور دَوری ڈنڈا اٹھا کر اُن پیاری عورتوں کے ساتھ تصاویر بنوا اور سو یورو کا ضمانتی نوٹ واپس لے کر باہر نکلے۔

☆☆☆

باب نمبر:2 میڈرڈ

- آٹوچہ کا گرین ہاؤس ٹروپیکل فاریسٹ جیسا نقشہ پیش کرتے ہوئے آپ کو جٹ چھاڈال لیتا ہے۔
- یا اللہ ہمیں ہدایت دے کہ اِس انگلش فوبیا سے باہر نکلیں یا پھر اِس یورپی یونین کو عقل دے کہ وہ بھی اِس بد بخت سے تھوڑی سی آشنائی کرلیں۔
- پہاڑ جیسی اُونچی کرسی پر بیٹھ کر گرما گرم پیزا کھانا پرلُطف تھا تو مشکل بھی۔

واہ آسمان ابر آلود تھا۔ٹھنڈی ہوائیں موٹی قمیض کے باوجود دل سے ٹکرائی تھیں۔چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی کہ اب طبیعت چونچالی پر مصر تھی۔ چند خوبصورت گلیوں اور چند شاندار سڑکوں کے موڑ کٹے اور بیسٹ ویسٹرن ہوٹل پہنچ گئے۔

چلیئے جناب کاؤنٹر پر لکھا پڑھی کے مراحل سے گزر کر کمرے میں سامان پھینکا اور ''چلو چلو'' دوبئی کی طرح ''چلو چلو'' اسٹیشن کا نعرہ لگاتے باہر نکل آئے۔

میٹرو قریب ہی تھا۔ باہم مشورہ ہوا۔

''لعنت بھیجو میٹرو کا بڑا جھنجھٹ ہے۔وہاں کی چیختی چنگاڑتی دنیا میرے مرمت شدہ دل کے لیئے موزوں نہ رہے گی۔تم ٹیکسی پکڑو۔''

سیما نے حتمی فیصلہ سُنا دیا تھا۔

ہوٹل والوں کے ایک فون پر ایک ہی منٹ میں ٹیکسی الٰہ دین کے جن کی طرح ظاہر ہوئی تھی۔موسم بڑا عاشقانہ سا تھا۔بادل گھرے اور ہوائیں خمار آلود تھیں۔سڑک حسین اور کناروں پر تمکنت سے کھڑی دورویہ عمارتوں کے سلسلے حسین تر۔

ریلوے اسٹیشن کی عمارت باہر سے کچھ غیر معمولی حسین نہ لگی تھی مگر جونہی شیشے اور سٹیل کے دروازوں سے اندر داخل ہوئے سامنے ایک بادبہاری جیسی دنیا تھی۔

یہ Atocha اسٹیشن ہے۔میڈرڈ کا پہلا اور بڑا اہم اسٹیشن جولگ بھگ 1851 میں ازابیل دوم کے مبارک ہاتھوں سے افتتاحی مرحلے سے گزرا تھا۔تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیچارے نئے نویلے اس عمارتی ڈھانچے کو آگ نے فنافی اللہ کر دیا تھا۔یہ موجودہ عمارت کوئی 1892 میں تعمیر ہوئی۔آٹوچہ اِس علاقے کا نام ہے اور یہ میڈرڈ کا جنوبی حصّہ ہے۔

اب ہم کھڑے اس کے روشن وجود کو دیکھتے اور سراہتے تھے۔رنگ و بو کا یہ جہان نیچے کی دنیا میں تھا۔اور وہاں تک جانے کے لئیے ایکسلیٹرز زوروشور سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھیں۔اُن پر جا چڑھے۔نصف راستے میں ریلنگ کے پاس کھڑے مجسمے کے پاس رُک کر تصویریں بنائیں۔پیچھے کا منظر اور حسین نظر آیا تھا۔دورویہ مٹیالی سرخ اینٹوں کے پویلین کے سر پر گلاس کی چھت ڈھلانی صورت میں تنی تھی اور بیچ میں گل وگلزار کا جہان کھلا پڑا تھا۔

آٹوچہ کا گرین ہاؤس آپ کو فوراً جٹ چھا ڈالتا ہے۔ٹروپیکل فاریسٹ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔کونسا پودا تھا جو یہاں نظر نہیں آتا تھا۔

Malabar Chestnut Tress کی ایک اپنی شان تھی۔فوارے میں مچھلیاں ناچتی پھرتی کہیں خود کو اور کہیں دیکھنے والوں کو لُبھاتی تھیں اور کچھوے ہر سائز کے

چھوٹے بڑے کہیں پتھروں پر، کہیں پانیوں میں پُھدکتے پھرتے تھے۔اس کے موتی اچھلتے آنکھوں کو بھلے لگتے تھے۔اِس گلزار میں چہل قدمی کرنے اور تالاب کے کنارے بیٹھنے سے قبل ہم نے ٹکٹ کا جھنجھٹ نپٹانے کا سوچا۔

ملحقہ وسیع وعریض کمرے میں مختلف کاؤنٹروں کے سامنے مختلف جگہوں کے لیئے جانے والی لائنوں سے پوچھتے پوچھاتے غرناطہ والی لائن میں جا کھڑے ہوئے۔

سچی بات ہے اللہ یا تو ہمیں ہدایت دے کہ ہم جو انگلش فوبیا میں سر سے پیر تک غرق ہیں۔اپنے بچوں کے منہ سے مادری زبان چھین کر انہیں اِس گٹ مٹ کی چکی میں پیسنے میں ہلکان ہو رہے ہیں۔یا پھر یورپی یونین کے ممالک کو اوپر والا تھوڑی سی عقل دے دے کہ وہ بھی زیادہ نہیں بس تھوڑی سی اس بدبخت سے آشنائی کر لیں۔تاکہ کاغذوں پر الٹی سیدھی تصویریں بنانے باڈی لینگویج سے سارے وجود کو ہلانے، گلا پھاڑنے، آنکھیں مٹکانے اور ہاتھوں کو لہرانے سے بیچارے پردیسیوں کو نجات مل جائے۔

ہم Granda Granada کا راگ الاپ رہے ہیں۔ان کے تلفظ میں n اور D کی آوازوں کو بہت لم لیٹ کر دیا گیا تھا۔اُدھیڑ عمر کا مرد جو چیز ہمیں سمجھانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا وہ تھی کہ غرناطہ تک کوئی گاڑی سیدھی نہیں جائے گی۔

Antequera سے آگے بس لینی ہوگی۔ بہت دیر اس کا بھیجا چاٹنے اپنا چٹانے اور بہت سارے ہمرائیوں کی رضا کارانہ کاوشوں کے نتیجے میں یہ سمجھ آیا کہ وہاں تک ریلوے ٹریک نہیں ہے۔

تو پھر کیا ہوگا؟

’’آپ کو آم کھانے سے غرض ہے کہ گھٹلیاں گننے سے۔ارے بھئی غرناطہ جانا ہے آپ کو۔یہ آپ کو وہاں پہنچائیں گے۔اب یہ ان کی مرضی کہ گھوڑوں، گدھوں، خچروں

پر لے جائیں یا بسوں، ٹرین، ہوائی جہاز پر۔ یہ دردسری ان کی ہے آپ کی تو نہیں۔‘‘

ہماری کوڑھ مغزی پر ایک جوڑے نے ہمیں سمجھایا۔

’’فی کس 82.90 یورو ادائیگی کے بعد گاڑی نے صبح 9.35 پر چلنا ہے۔‘‘

9.35 ڈپارچر ٹائم کسی غبی بچے کی طرح دہراتے باہر نکل آئے تھے۔

مچھلیوں اور مینڈکوں کو دیکھا جائے۔ کچھ کھایا پیا جائے۔ تھوڑی دیر بیٹھا جائے یہاں اس وقت بارہ بج رہے ہیں۔ شہر کا دورہ کرنے والی بس ہوپ ان ہوپ آف کا فائدہ نہیں۔ آدھی دیہاڑی باقی رہ گئی ہے۔

اس تجویز پر کوئی مخالف رائے سامنے نہیں آئی۔ سب کام کیئے۔ سوائے کھانے پینے کے کہ بقیہ دونوں کا کہنا تھا۔’’ابھی ناشتہ ہضم نہیں ہوا۔‘‘

بروشرز سے تھوڑی سی مزید معلومات بھی حاصل ہوئیں کہ بیچارہ ریلوے اسٹیشن القاعدہ کی عتاب کا بھی نشانہ بن چکا ہے۔ اب یہ حقیقتاً القاعدہ کی کاروائی تھی یا اس پر ملبہ ڈالا گیا تھا۔

واقعہ تھا سپین کے جنرل الیکشن سے صرف تین دن پہلے کا۔ 192 لوگ تو سیدھے سیدھے موت کے منہ میں گئے جب کہ کوئی بیس (20) تا پچاس (50) کے قریب زخمی ہوئے۔ پہلے تو ایک دوسرے کو پھٹکارہ گیا۔ یعنی ملک کی دونوں سیاسی پارٹیوں یعنی سپین سوشلسٹ ورکرز پارٹی اور پارٹیڈو پاپولر Partido Popular کے درمیان الزام تراشی اور دشنام طرازی کا جی دار مقابلہ ہوا۔ مگر چند دنوں بعد توپوں کا رُخ علیحدگی پسندوں Euskadi Ta Askatasuna (ETK) کی طرف موڑ دیا گیا۔ بعدازاں القاعدہ کو گھسیٹ لیا گیا کہ پی پی نے عراق میں فوجی بھیجے تھے جسے پورے سپین میں انتہائی ناپسندیدہ ٹھہرایا گیا تھا۔

جب بم دھما کہ ہوگیا تو احتجاجیوں نے جلوس نکالے اور مطالبہ کیا کہ ہمیں جواب تو دو اور سچ تو بتاؤ کہ بیچ میں مسئلہ کیا ہے؟

اکیس ماہ بعد عدالت تو القاعدہ کے ملوث ہونے کو بھی ثابت نہ کرسکی یہ اور بات ہے کہ تنقید کی سان پر وہ چڑھی رہی۔

تو سوچا کہ چلو اب یادگار کو بھی دیکھ لیتے ہیں کہ دو چھلانگیں مارو اور اس کے ویہڑے میں اُتر جاؤ والی بات ہے۔ چلو ان بدنصیبوں ،اُن معصوموں کو یاد کرآئیں جو بیچارے یونہی مفت میں،ہی بڑے لوگوں کی ایسے،ہی خود غرضیوں اور نفرتوں کا ایندھن بن گئے ہیں۔کون جانے کتنی تمناؤں سے گھروں سے نکلے ہوں گے یا گھروں کی طرف آتے ہوں گے۔کون جانے کِس کے دل میں کیا تھا۔کتنے منصوبے، کیسے کیسے ارمان،خواب اور خواہشیں سب جیسے پل جھپکتے میں راکھ ہوگئیں۔رہے نام تیرا میرے مولا۔

گردن کو اٹھا کر اُس بلند وبالا دیوہیکل ٹائپ سلنڈر کو دیکھا جس پر مرنے والوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔کھڑکیوں، دیواروں پر عام لوگوں کے متحرک پیغامات نے بھی متاثر کیا جو حملے کے بعد یہاں آئے اورانہوں نے اپنے دکھ اور کرب کا اظہار کیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اٹوچہ ریلوے اسٹیشن ایک آرٹ گھر ،فطرت کا شاہکار، ایک جنگل گھما گھمی سے بھرا شور مچاتا ایک ایسی جگہ جہاں کھانے پینے کی خوشبوئیں دامن دل کو کھینچتی تھیں۔ جہاں آپ کو اِس جہاں کی دوسری دنیاؤں میں جانے کا اذن ملتا ہے۔

اب جب باہر نکلے تو ہلکی ہلکی رم جھم کا سلسلہ شروع تھا۔سڑک کی سیاہی پانی کے ذرا سے چھڑکاؤ سے زیادہ نمایاں ہوگئی تھی۔اب میں میٹرو کے بھنوروں میں پھنسنے کے لیئے مضطرب اور سیما ٹیکسی لے کر گھر چلنے کو بے قرار۔چل چھوڑ میٹرو۔کسی بس پر چڑھ چلتے ہیں۔

اس نے ایک زوردار دھپّا میری کمر پر لگایا اور بولی۔ ''سیدھی طرح چل۔ابھی پہلی بونی کاتی ہے۔بارہ دن رہنا ہے۔تجل خواری کے سارے شوق پورے کر لینا۔''

بھئی بڑی ہی نظم وضبط والی قوم ہے۔ہماری طرح تھوڑی کہ جہاں کھڑے ہے وہیں سے گزرتی کسی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روک لو۔نہ بابا نہ۔سٹینڈ پر جانا تھا۔لائن میں لگنا تھا۔ٹیکسی نے نمبر سے آگے آنا تھا۔میں تو مزے سے آرٹ کے اُن دو معصوم بچوں کے مجسموں کے قریب دھری بینچ پر بیٹھ گئی۔خوبصورت موسم کی رعنائیاں چہار سو بکھری ہوئی تھیں۔دیر بعد جب وہ میرے پاس سے گزر کر آگے بڑھنے لگیں تو جا کر اُن کے ساتھ شامل ہوگئی۔

ہوٹل میں یہ بڑی اچھی بات تھی کہ چائے کا پورا انتظام تھا۔خوبصورت ٹرے میں سجی الیکٹرک کیٹل، کپ، ٹی بیگز اور چینی کے ساتھ موجود تھے۔ٹی بیگز کو باریک بینی سے چیک کیا گیا۔پھر نئی یاری کی بجائے پرانی دوستی کو ترجیح دیتے ہوئے لپٹن زندہ باد کہا اور اپنے پیارے پاکستان سے لائی پتی دودھ نکال لیا۔

اور جب سیما جیسی سُگھڑ خاتون چائے بنانے میں مصروف تھی۔میں نے کمرے کی اکلوتی کھڑکی کی چہرہ کشائی کی۔سامنے اسی کی کزنوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔چند لمحوں کی روکھی پھیکی دید کے بعد میں نے پردہ کھینچ دیا۔اِس ڈر سے کہ اگر کسی نے سیاہ جنگلے والی بالکونی میں آ کر یہ گانا شروع کر دیا کہ میرے سامنے والی کھڑکی میں اِک چاند سا چہرہ رہتا ہے۔

ہائے میرے اور مہر النساء کے لیئے تو ڈوب مرنے والی بات ہوگی۔ہاں البتہ سیما کے لیئے کچھ ٹھیک ہے۔چلو چودھویں کا نہ سہی کہ اب چاند ڈھلنے والی منزل میں ہے۔ہاں آخری شب کی دسویں، گیارھویں والی بات تو ابھی بھی ہے۔اس کے یہاں۔

اپنے اپنے بستروں پر بیٹھ کر اِس اجنبی دیس کے اِس خوبصورت کمرے میں چائے پینے اور گپیں مارنے کا شغل بڑا دلچسپ تھا۔ ہائے زندگی کے یہ لمحے کتنے حسین ہیں؟

سیما الحمرا کے ٹکٹوں کے لیئے کِس قدر مضطرب تھی اس بارے اگر سچ لکھوں تو سچی بات ہے وہ یاوہ گوئی کے زمرے میں شمار ہوگا۔ مگر حقیقت یہی تھی کہ اس کا مرمت شدہ دل جیسے الحمرا میں پھنسا پڑا تھا۔

تو اٹھو گھومنے نکلیں اِس شہر دلربا میں جو سپین کا اگر دل نہیں تو جگر ضرور ہے۔ جس کے اندلیسی حصّے میں ہماری ملّی اور تہذیبی نال گڑی ہوئی ہے۔ جب باہر نکلے۔ تو گلی کا پہلی بار ناقدانہ جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ یہ حسینہ تو بالکل کسی پہاڑی درّے کی من وعن تصویر ہے۔ دورویہ بلندوبالا عمارات کے نرغے میں پھنسی ہوئی۔ تھوڑا سا ہی چلنے پر مرکزی شاہراہ کے بھریئے میلے میں آ گئے۔ بلندوبالا جگمگاتی عمارتیں ہر عمارت اپنی تعمیری ساخت کے اعتبار سے منفرد۔ سڑکوں پر دھواں دھار قسم کی ٹریفک مگر سب قاعدے طریقے میں سمٹی ہوئی۔ شتر بے مہار والی کیفیت کا کوسوں دور نام ونشاں تک نہ تھا۔

سب لین چھوٹے چھوٹے کھوکھوں سے سجی تھیں جہاں ایشیائی اور افریقی ملکوں کے کالے اور گہیواں رنگ کاروبار سجائے بیٹھے تھے۔

پلازہ ڈیل Plaza Del Callao کے میدان میں آ کر شیڈ کے نیچے بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ میڈرڈ کی مشہور مرکزی مصروف ترین جگہ تھی۔ سامنے سینما ہاؤس تھا۔ بڑی سی سکرین پر اشتہارات چلتے تھے۔

’’چلو فلم دیکھ لیں۔‘‘ میں نے تجویز دی۔

سیما نے ہنکارہ بھرا۔’’ پلّے لفظ نہیں پڑنا۔‘‘

تو جس سکوائر میں بیٹھے تھے۔ اس بارے پتہ چلا تھا کہ پچھلی صدی میں یہاں بڑی

خوفناک جنگ ہوئی تھی۔ بڑی تباہی ہوئی تھی۔

’’تو ہوئی ہوگی بھئی اب کیا کریں۔جنگیں تو ہوتی چلی آئی ہیں اور انہوں نے آگے بھی ہونا ہے۔اس تھرڈ دلے بندے کے پاس طاقت آجائے تو اسے کون لگام ڈالے۔

تصویریں بنائیں اور کھانے کے لیئے دکانوں میں جھانکنا شروع کردیا۔ایک جگہ دل ٹھکا۔دُوکان تو بس چھوٹی سی تھی۔ پر کیا کمال کے پیزے کہیں اندر لگی برقی بھٹی میں سے نکل نکل کر سامنے آرہے تھے۔راہگیروں کے منہ میں پانی بھر رہا تھا۔تو بھلا ہمارے منہ میں نہ آتا جو بھوکے تھے۔

ویجی ٹیبل پیزا۔تین بار دہرانے اور پوری تشفی کرنے کے بعد اندر آگئے۔اف کرسیاں اتنی اونچی جیسے ہمالیہ کی سہیلیاں ہوں۔ ہائے ان پر کون بیٹھے گا؟ بھئی ہم بڑھیاں تو اب پھدکنے اور اچکنے کا خطرہ مول لینے کی حالت میں ہی نہ تھیں کہ ان گٹے گوڈوں کی سلامتی کے لیئے راتوں کے اندھیروں میں چپکے چپکے اُٹھ کر دعاؤں کے ڈھیر لگائے تھے۔

خدا کا شکر یہ جانگسل سا مرحلہ کسی نہ طرح طے ہو ہی گیا۔پیزا اتنا گرما گرم اور مزے کا تھا کہ اُسے اِس پہاڑ جیسی اونچی کرسی میز پر ہی بیٹھ کر کھایا جاسکتا تھا۔10 یورو۔ ساتھ کولڈ ڈرنک بھی۔ سچی ہم عورتیں بھی کیسی بنیئے بن گئی تھیں۔حساب کتاب بھی فوراً ساتھ ساتھ۔کیا مجال اس میں پل کا بھی وساہ کھائیں۔کاغذی نوٹ، سکے،سینٹ ٹکے ٹکے پائی پائی۔میری طرف تیرے دو سینٹ۔ تیری طرف ایک یورو۔تم نے مجھے دس (۱۰) سینٹ دینے ہیں۔

’’یہ لو اپنے دس سینٹ اور مجھے تین یورو دو۔‘‘ واہ کیا مزے کا کام تھا یہ بھی۔

پلازہ دی سانتا اینا میں سپین کے انقلابی شاعر گارشیا لورکا کو دیکھا۔سکوائر کے عین وسط میں گرینائٹ کے چھوٹے سے چبوترے پر کھڑا ہاتھوں میں یقیناً فاختہ پکڑے اُسے

اڑانے کی کوشش میں نظر آتا تھا۔ گارشیا لورکا سے کوئی شناسائی نہیں تھی آنے سے قبل انٹرنیٹ پر پھولا پھرولی میں کچھ نام سپین کے حوالے سے ابھر کر سامنے آئے تھے۔ مگر کہیں جانے سے قبل پھوہڑ اور بے سلیقہ قسم کے لوگ جو تماشے کرتے ہیں میرے ہاں بھی ویسے ہی منظر تھے۔ افراتفری اور بھاگ دوڑ کے چکروں میں گارشیا لورکا بھی کہیں دب دبا گیا ہوگا۔

خوبصورت بلند و بالا عمارتوں کے جلو میں اِس سکوائر میں اُسے ایک دلکش انداز میں دیکھنا بڑا خوبصورت اور پرکشش لگا تھا۔ اردگرد بنے کھوکھوں میں سے چند کتابوں اور رسائل سے بھی بھرے ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھ کر دیکھنے سے اس کی چند ترجمہ شدہ نظموں پر مشتمل کتاب نظر آئی تو اسے خریدا۔ بائیوگرافی بھی تھی۔ مگر اتنی ضخیم تھی کہ اُسے خریدنا مشکل نہ تھا مگر اٹھانا دشوار۔

سچی بات ہے ۔ایک پررونق شہر کی رات اپنی توانائیوں کے ساتھ جوان تھی۔ بروشروں پر بنے نقشے سمجھ سے بالا تھے۔

''دفع دور کرو۔ دیکھو اور لُطف اُٹھاؤ۔ دائیں بائیں چلو پھرو۔ جو سمجھ آئے ٹھیک جو نہ پلّے پڑے اسے گولی مارو۔

رات خوبصورت ہے۔ جوان ہے، حسین ہے۔ حسن و رعنائی سے بھرے پرے نظاروں میں پور پور ڈوبی ہوئی ہے۔ گلیوں، بازاروں، دکانوں میں گھومتے ونڈو شاپنگ کرتے اس دنیا اور اس کے رنگ ڈھنگ دیکھتے جب تھک کر چور ہوگئے تو اسی دکان پر آ کر پیزا کھایا اور گھر لوٹ آئے۔

☆☆☆

باب نمبر:3 غرناطہ کے لیے روانگی

- میدرڈ میں صرف اٹھارہ گھنٹوں میں ہمارا سٹیٹس اپ۔ہم بی سے اے کلاس میں منتقل۔
- غرناطہ جانے والا راستہ ہمارے ہاں کے پوٹھوہاری علاقے جیسا ہی تھا۔
- غرناطہ کا قدیم ترین مرکزی حصّہ تاریخی عمارتوں اور قدیمی ورثے سے سجا کسی جدّی پشتی شہزادی کی مانند نظر آیا تھا۔

ابھی صبح تو کہیں رات کے قدموں میں پھنسی بیٹھی تھی۔ پر مہرالنساء کی کھٹ پٹ نے جگا کر رکھ دیا۔ایک اللہ مارے اس کے جوتے جانے ِکس ڈھیٹ شور شرابے اور چیخم دھاڑ قسم کی پلاسٹک سے بنے ہوئے تھے۔اوپر سے کمرے کا چوبی فرش بھی بڑا ہی بے مروتا اور بدسماظا سا تھا۔اِس چلت پھرت پر کُھل کر ناراضی کا اظہار کرتا تھا۔

ابھی اس نے باتھ روم میں گھس کر بہتے پانی کی شرل شرل والی موسیقی سے بھی ہمیں محظوظ کرنا تھا۔جی تو چاہا تھا کہ رضائی پرے پھینکوں اور اُسے پکڑ کر چھترول کر دوں۔مگر مجبوری تھی۔قہر درویش بر جان درویش والا معاملہ تھا۔تکیہ کانوں پر رکھ کر رضائی سے منہ ڈھک لیا۔

ابھی گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ ’’اٹھو نماز پڑھ لو‘‘ کا ورد شروع ہو گیا۔

نماز کے لیئے اٹھنا تو تھا ہی مگر نیند بھی تو پوری چاہیے تھی کہ صبح سفر پر روانہ ہونا تھا۔ سیما کو بھی تپ چڑھی ہوئی تھی۔

بہر حال اٹھنا پڑا تھا۔نماز کی ادائیگی کے بعد رسان سے مہرالنساء کو سمجھانے کی اپنی سی کوشش کی۔

’’دیکھو ہمسائیوں بارے اسلام بڑا احساس ہے۔دوستوں اور ساتھیوں بارے بھی ۔تو اس وقت ہم تمہارے ساتھ ساتھ دوہرے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔رہی نماز کی بات تو جانی تو اپنی نبیڑ تجھے پرائی کی کیا پڑی؟

شکر اُس پرورد گار کا کہ اس نے چپ چپاتے انہیں کڑوے یا میٹھے گھونٹ جان کر پی لیا۔

جیسے ایک ہی دن میں ہوٹل کے سلسلے میں ہمارا اسٹیٹس بڑھ گیا تھا۔ہم گریڈ بی سے اے میں آگئے تھے۔تو ایسے میں ناشتہ بھلا پیچھے کیوں رہتا؟ ہماری پنجابی زبان کی کہاوت کے مطابق’’ او کہیڑا اکسے نہوجنوائی توں گھٹ سی‘‘ (یعنی ناشتہ کون سا کسی بہو اور داماد کے نخرے تخروں سے کم تھا۔) دو یورو اضافی کی اس نے بھی چھلانگ ماری تھی۔

ضرب تقسیم کے چکر سے ذہن نہیں نکلتا تھا۔ 1397 = 127 x 11 تو بھئی لازم تھا ناکہ حساب کتاب کچھ برابر ہوتا۔ گلے گلے تک ٹھونسا جاتا۔کچھ خشک قسم کی ٹائپ چیز کو بھی ٹشو میں لپیٹ کر بیگ میں رکھا جاتا۔گڈی پر چڑھنا تھا۔دیر سویر سب ساتھ تھے۔

میں تو سچی بات ہے ایسے چوری چکاری اور ہیرا پھیری کے کاموں میں بڑی تیز ہوں۔نگران عورتوں کی آنکھ بچا کر دو تین چیزوں کو پار کر جاتی ہوں۔سیما نے اناڑی پن کا ثبوت دیا۔جب وہ تین پائیز اپنے بیگ میں رکھنے لگی ویٹرس نے دیکھ لیا۔دڑکی لگاتے

ہوئے قریب آ کر بولی۔

''یہ سب آپ کے یہاں کھانے کے لیئے ہے۔ لے جانے کے لیئے نہیں۔''

سیما نے فوراً ہاتھ روک لیا۔ میں اس وقت اپنی پلیٹ بھرنے کے لیئے میزوں پر رکھی اشیاء کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ واپس آئی۔ پوچھا تو اِس سانحے کا پتہ چلا۔

''تم بھی نری گاؤدی ہو۔ ابھی میں اُس گوری کو ڈبہ بھرتے دیکھ کر آ رہی ہوں۔ جو اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ سامنے والی میز پر بیٹھی ہے۔ تم سے پھوٹا بھی نہ گیا کہ یہ چڑھائی ہمارے لیئے ہے۔ جا کر اس کا بیگ تو کھلواؤ۔

سیما شریف عورت ہے۔ چپکی ہو رہی۔ تاہم میں نے کاروائی مکمل کی۔ تین پیٹیز ٹائپ کو ٹشو پیپروں میں لپیٹ کر پرس میں رکھا۔ اور مزے سے ہنستے ہوئے دونوں کو اپنی زبان میں سُنایا۔

تمہاری ایسی تیسی۔ پردیسی ہیں ہم۔ تمھاری تو گاڑیاں بھی ولایتی رنڈیوں جیسی ہیں۔ خوبصورت، شاندار، طرح دار، مہذب اور ایٹی کیٹس والیاں۔ کوئی ہماری طرح تھوڑی چیختے شور مچاتے اسٹیشن ہیں جہاں نان پکوڑے، اُبلے انڈے، سموسوں کی آوازیں گونجتی ہیں۔ تو ہمارے کانوں میں مانو جیسے رس سا گھلنے لگتا ہے۔ ہائے کتنا مزہ آتا ہے۔ چائے گرما گرم۔ گاڑی میں بیٹھنے کے ساتھ ہی پٹارے کھل جاتے ہیں۔ سفر کرنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

جب اٹیچی کیس بند ہو گئے۔ ہم نے اوپر والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے تو اِس کافرستان میں تیرا نام لے لیا ہے۔ اب آ گئے تیری مرضی اور میرے بھاگ لچھیئے۔''

کاؤنٹر پر چابی دیتے، ٹیکسی منگوانے کا کہتے اور ڈپلومیٹک قسم کی الوداعی مسکراہٹیں

بکھیرتے ہوئے دفعتاً سیما نے سامان کو سٹور کرنے کے متعلق پوچھا۔

''فی کس 250 یورو فی دن۔''

''آجا میری جان آجا۔ ٹکے کی بڑھی اور آنہ سرمنڈائی والی بات ہے یہ تو۔''

ایک فون کال پر ٹیکسی کا آجانا جیسے الہ دین کے جن کے حاضر ہوجانے کی طرح تھا۔ جب باہر نکلے تو سر پر کیا رُوح تک سرشاری میں لُتھڑ گئی۔ آسمان گہرا ابرآلود اور کن من کن من کرتی بوندیں۔

''واؤ۔ یہ سہانا سفر اور یہ موسم حسین۔'' ہم تینوں پکار اٹھیں۔

سارا شہر اِس کن من، کن من کی موسیقی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سڑکیں، اطراف میں تاحد نظر جاتی گلیاں اُن میں چھاتے پکڑے چلتے پھرتے لوگ۔ ماحول کِس قدر رعنائی سے بھرا ہوا تھا۔ ایک نئی دنیا، ایک نئے سفر کی جانب رواں دواں۔ میرے پروردگار زندگی کتنی حسین ہے۔ اور ہمارے اوپر یہ تیری کتنی بڑی عنایت۔ سچ تو یہ ہے کہ ماحول پر اور اوپر والے پر صدقے واری ہونے کو جی چاہتا تھا۔

قطاروں میں لگ کر اور سیکورٹی کے مرحلوں سے گزر کر ایک وسیع وعریض ویٹنگ لاؤنج میں پہنچے۔ جہاں انفرمیشن بورڈ پر مختلف ٹرینوں کے اوقات اور ٹرمینل نمبر آرہے تھے۔ سیویا Svila (اشبیلہ) کے لیئے لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ ہمارا نمبر ابھی کافی اوپر تھا۔ بینچ پر بیٹھ گئے۔ عورتیں، بچے، مرد، بوڑھے۔ ہائے اِس گڈی اور اسٹیشن میں کتنی رومانیت، کتنی فینٹسی اور کتنا نوسٹلجیا والی کیفیت ہے۔ لبوں پر اپنا دیسی نغمہ تھرکنے لگا تھا۔

نی گڈ یئے توں آنی تے جانی ایں۔ کیناں نوں ملانی ایں تے کیناں نوں وچھوڑنی ایں۔

سامنے والی لمبی قطار پل جھپکتے میں شیشوں کے خودکار دروازوں سے اندر چلی

گئی۔ کاؤنٹر بند ہو گیا۔ اس بار میرے اندر اطمینان وسکون کی لہریں رقصاں تھیں۔ وہ پرانا ڈر خوف بے چینی اور اضطراب سب عنقا تھے۔ بس خدا کے رنگ دیکھتی تھی۔ زیادہ بھاگنا نہیں پڑا۔ کچھ دیر بعد کاؤنٹر وہیں سج گیا۔ جس کے سامنے ہمارا ڈیرہ تھا۔ بڑی نرم خو قسم کی موٹی تازی عورت نے اُسے سنبھال کر کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

یہاں زندگی کس تیز رفتاری سے گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتی ہے۔ برقی زینوں سے اترتے ہی بس ایک اچٹتی سی نظر پلیٹ فارموں پر کھڑی گاڑیوں پر ضرور ڈالی پھر تیزی سے اس نوجوان خوش شکل سی لڑکی پر ڈالی جو گاڑی کے عین سامنے کھڑی راہنمائی کے لئے موجود تھی۔ سکون بھرا لمبا سانس کمپارٹمنٹ نمبر 4 میں داخل ہو کر اور وہاں چند لمحے رُک کر سینے سے نکالا تھا۔

راستے کی خوبصورتی بارے وہ پرانے وقتوں کا متروک جملہ سولہ آنے سچ کہنا زیادہ چاشنی لیئے ہوئے ہے۔ یہ مجھے زیادہ ترجمانی کرتا محسوس ہوتا ہے۔ علاقہ ہمارے ہاں کے پھوٹوہاری پستہ قامت اور کہیں درمیانی قامت والی پہاڑیوں کی سی صورت لیئے ہوئے تھا۔ تاہم زیتون کے پیڑوں کے سیل رواں کا جو بہاؤ ان پر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ یہ بات بتانے کے لیے کافی تھا کہ سپین زیتون جیسے قیمتی جنت کے پھل کا گھر ہے۔

راستے میں تین شہر دیکھنے کو ملے۔ منظّم، ضبط وقیود کے دائروں میں سمٹے ہوئے۔ ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ فطرت کے عطا کردہ حُسن کو جسطرح بے ہنگم آبادی کے پھیلاؤ نے ناس مار دیا ہے۔ پنجاب کے لینڈ سکیپ، تھر اور چولستان کے صحرائی اور پہاڑی علاقوں کا حسن پاکستان جیسے ملک کو جو رعنائی دیتا ہے اُسکا ہم اپنے ہاتھوں خود ستیاناس کر رہے ہیں۔ ٹرین کا رُکنا بھی ایسا ہی تھا جیسے ابھی سانس بھرا ہو اور اسے خارج بھی کر دیا ہو۔

میں نے اپنے اور غیروں کے اس تقابلی جائزوں میں دردناک قسم کی آہیں سینے

سے نکالنے والے عمل پر دوحرف لعنت کے بھیجے۔اور خود کو جو مل رہا ہے'' اُس سے لُطف و شادمانی اٹھا'' جیسے ترغیبی جملوں سے مائل کرتے ہوئے باہر دیکھا۔

موسم تو ابھی تک حشر سا اٹھائے ہوئے تھا۔ بارش ہو رہی تھی بس رفتار میں کمی بیشی تھی۔

انتکورہ (Antequera) پر جب اُترے تو اسٹیشن پر جیسے ہوکا عالم تھا۔ چھاجوں پانی برس رہا تھا والی بات تھی۔اب ہونقوں کی طرح کھڑے جائزہ لے رہے ہیں کہ جانا کدھر ہے؟ ایک دو سے راہنمائی چاہی انہوں نے اپنے ساتھ ہی چلنے کا اشارہ دیا۔ برقی زینوں سے ایک بڑے ہال میں داخلہ اور وہاں سے باہر کھڑی بسوں میں لدلدائی۔

''اُف'' میں نے کوفت اور بیزاری سے اپنے گردوپیش کو دیکھا اور بڑبڑائی

''اللہ اگر تو میری ان ساتھیوں کو تھوڑی سی ہدایت دے دیتا تو بھلا تیرا کچھ بگڑتا۔اب دیکھنا دونوں کے یہ بھاری بھرکم اٹیچی کیس جنہیں اٹھانا کیا گھسیٹنا بھی مشکل اس چھم چھم برستی بارش میں بس کے نچلے سامان والے حصّے میں انہیں کسی نہ کسی طرح ٹھونسنے میں کس طرح ہلکان ہو رہی ہیں۔گو ایک دو ہمدرد دل مردوں نے تھوڑا سا ہاتھ پلّا بھی مروایا ہے۔اب سیدھی ہو کر خود کو دیکھتے ہوئے کتنی متاسف ہیں کہ پوری نہیں آدھی تو ضرور بھیگ گئی ہیں۔

بارش، گھرے جھومتے بادل،اس طرح کا سہانا سفر یقیناً سب بڑا رومانوی سا ہے مگر اس سارے رومانس کا بیڑہ غرق ہو گیا ہے۔انتکورہ میں موسم کی یہ کوفت بھری پزیرائی بہت ہی گراں گزر رہی ہے۔

انہیں کوستے کوستے اب اپنے آپ پر بھی گن کر کوئی بیس بار لعنت بھیجی۔'' بڑی سلیقہ شعار بنتی پھرتی تھی۔ڈھائی کلو کا رین کوٹ سامان میں ٹھونس کر چلی تھی۔موسم تو کل سے

ہی ٹھیک نہ تھا۔ پہننے میں ہرج تھا کیا؟ کیا۔ تو کونسی حُسن پری ہے کہ رین کوٹ پہننے سے خوبصورتی پر اثر پڑتا۔ اب آدھی گیلی آدھی سوکھی۔ چکھ مزے۔ تجھے تو زرا سے گیلے سے وحشت ہونے لگتی ہے۔

گاڑی کے گرم ماحول نے تھوڑا سا آسودہ کیا۔ شیشوں سے باہر دیکھنا شروع کیا۔

سوا گھنٹے کے سفر نے مجھے کیا کچھ نہیں یاد دلایا۔ غرناطہ سے پہلی محبت کا باعث نسیم حجازی تھا۔

اُس کے ناول ''شاہین اور یوسف بن تاشفین'' کوئی ایک دو بار اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو دسیوں بار پڑھے۔ بدر بن مغیرہ ناول کا نہیں اپنا ہیرو بن گیا تھا۔ اس کے کردار کی وہ فینٹسی۔ کچھ شدت میں اضافے کا باعث مستنصر حسین تارڑ بھی ٹھہرا۔ ''اُندلس میں اجنبی'' ہمیشہ حرزِ جان بنی رہی۔ جوانی کے یہ عشق اور اب بڑھاپے میں اس معشوقہ سے ملاقات۔ واہ کیا حسن اتفاق ہے۔ صدقے جاؤں مولا تیری نوازش کے۔

اب بھلا آسمان کو محبوبیت سے کیسے نہ دیکھتی کہ وہاں جا رہی تھی جہاں جانے کی سدا سے حسرت تھی۔ بس تھوڑا سا گلا ضرور تھا کہ بڑی دیر کی مہربان یہ عنایت کرتے کرتے۔ چھوٹے سے اس سفری ٹوٹے میں آنکھوں نے زیتون کے علاوہ بھی کھیتوں میں کچھ اُگا ہوا دیکھا۔ یہ سبزیاں تھیں۔

ترقی یافتہ ملکوں کے دور افتادہ شہر بھی اپنے ہونے کا اعلان شان و شوکت سے کرتے ہیں۔ غرناطہ کا مضافات بھی صاف ستھرا اور قرینے سے سجا سنورا سامنے آرہا تھا۔ سڑکیں خوبصورت دو رویہ، سہ یا چہار منزلہ عمارتیں کہنگی یا خستگی کے داغ دھبوں سے پاک صاف، بارش میں بھیگتے درخت اور انسان جن کے سروں پر تنے چھاتے سب بہت اچھے لگ رہے تھے۔

اور ہماری محویت کا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔بس ایک احاطہ میں داخل ہوئی تھی جہاں قطاروں میں لگی انتظار کرتی ٹیکسیاں مسافروں کی منتظر تھیں۔کہیں کوئی خجل خواری نہیں،کوئی پریشانی نہیں کہ اُترنے کے بعد ٹیکسی ڈھونڈنے کے لئے ذلیل ہونا پڑے گا۔

ڈرائیور ہمیشہ سامان اُتروانے اور گاڑی میں رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ٹیکسی میں بیٹھنے کے ساتھ ہی میں نے ہوٹل کے نام اور پتے والا کاغذ اس کے آگے کر دیا۔اُس نے موبائل آن کیا۔اس پر نقشہ آیا۔بس لمحے بھر کی بات تھی۔سر ہلا اور گاڑی چل پڑی۔

شہر تو خوبصورتی اور حُسن میں اپنی مثال آپ تھا۔ماضی کا غرناطہ اور حال کا ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔بارش کی صورت کچھ دھواں دھار قسم کی تھی۔بڑی خوبصورت گلی تھی۔جس کے باہر ہوم گرینیڈا Home Granda کی تختی آویزاں تھی۔بند دروازہ ڈرائیور نے کھولا۔ہم نے تو فوراً اندر گھسنے کو ترجیح دی۔

یہ گرینیڈا ہوم کیسا ہے؟اس کا کچھ تنقیدی جائزہ لینے سے قبل ہی دو مردوں ایک قدرے اُدھیڑ عمر اور دوسرا جوان نے نام پتہ دریافت کرنا شروع کر دیا۔

سوال جواب سے فارغ ہو کر بشاشت سے زرا دائیں دیکھا۔بائیں طرف نگاہ کی۔دروازے کے ساتھ مختصر سی ڈیوڑھی۔مختصر سا ہی صحن چمکتی سُرخ اینٹوں والا۔گہرے فیروزی نما نیلے صوفے پر بیٹھتے ہی نگاہیں زرا پرے میز پر دھرے پھولوں پر پڑیں۔لگا جیسے انہوں نے ہنس کر خوش آمدید کہا ہو۔

پھر ہنسی آئی۔واہ کیا ہی کہنے ہماری خودفریبی کے۔

پاکستانی زمینی پیمائش کے حسابوں یہ بمشکل پانچ مرلے کا دکھتا تھا۔چھوٹا سا مگر بے حد صاف ستھرا،ہری کچور بیلوں اور پودوں میں مسکراتا ہنستا ہوا۔زینہ دیکھ کر گھبراہٹ ہوئی مگر لفٹ کا جان کر اطمینان بھرا سانس لیا۔

سیما کا اضطراب آفس میں بیٹھتے ہی الحمرا کے ٹکٹوں کے لیئے جیسے پھٹ پڑا۔خدا کا شکر کہ دونوں مردوں کے پاس انگریزی کا دال دلیا تھا۔انہوں نے کہا چار بج رہے ہیں۔آن لائن ٹکٹنگ بند ہو جاتی ہے اِس وقت۔کل کوشش ہوگی۔

تاکید،مزید تاکید اور مزید تاکید پر اکتفا نہیں تھا۔ التجا،درخواست، عاجزانہ لب و لہجے میں لپیٹ لپیٹ کر کچھ اِس انداز میں کی کہ بے چارے شرمندہ سے ہوگئے۔

ساری دفتری کاروائی نپٹا کر کمرے بلکہ کہنا مناسب ہوگا کہ کمروں میں گئے کہ دو کمرے بمعہ کچن کھانے کی میز اور چار عدد کرسیوں سے سجا اپارٹمنٹ ملا تھا۔یہ اور بات تھی کہ سامان کی ٹھنسا ٹُھنسی ہوی پڑی تھی۔مگر ہم تو بڑے خوش تھے۔الیکٹرک چولہوں کا طریق کار سمجھا۔کیبنٹ کھول کر پلیٹیں کیا دیگچیوں اور چُھری چمچوں کی تفصیل جانی۔

چلو جی موجیں ہی موجیں۔

باہر بارش برستی تھی۔اندر ہم اپنے خوابوں کے شہر غرناطہ کے ایک کمرے میں بیٹھی گرم گرم چائے پیتی تھیں۔ذرا بارش تھمی تو ہم باہر نکلے کہ کچھ کھائیں پئیں۔بھوک سر پر چڑھی درد کی صورت ناچتی تھی۔گلی پرتنا آسمان ابھی بھی اشتعال میں تھا۔

نکڑ پر ٹھہر کر منظر کی دلربائی پر نگاہ ڈالی۔سامنے پارک تھا۔ہرے کھجور درختوں سے بھرا،گھاس کے قطعوں سے سجا،ٹپ ٹپ بوندوں سے ٹپکتا۔بارش کا پانی طریقے سلیقے سے سڑک کی ڈھلوانی جگہ سے نالی کی صورت تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا۔

Samleronimo نامی یہ علاقہ اب رہائشی نہیں کمرشل ہے۔بغل در بغل کُھلتی گلیاں ایسے ہی ہوٹل نما اپارٹمنٹس میں تبدیل ہو چکی ہے۔کبھی یہ متوسط لوگوں کے گھر تھے۔فرنٹ پر ریسٹورنٹ اور دکانیں تھیں۔سیما اور مہر النساء فوراً گارمنٹس کی ایک دکان میں جا گُھسیں۔

میں باہر کھڑی ماحول کے منظروں کو جذب کررہی تھی۔اِس منظر میں ایک اور دلفریب منظر نے داخل ہوکر توجہ کھینچ لی۔یہ سبز رنگ کی تین ڈبوں پر مشتمل ہوپ آف اور ہوپ آن کی گاڑی تھی۔جس کے کھلے ڈبوں میں سیاح بیٹھے لطف اٹھاتے تھے۔اندر نے کلکاری بھری۔

''بھئی یہ تو موجیں ہوگئیں۔بہترین طریقہ شہر کی سیر کا''۔

سرشاری نے نہال کردیا۔طمانیت نے طبیعت کو ہشاش بشاش کردیا۔

چند قدموں پر ریسٹورنٹ تھا۔اندر جاکر شو کیسوں میں سجے پیزوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ویجی ٹیبل پیزا تازہ۔سامنے اورنج جوس کی بڑی سی مشین دیکھ کر تین جوس کا بھی آرڈر کیا۔تازہ کی تاکید کی جس کی ضرورت تو نہیں تھی۔تاہم دودھ کا جلا جیسے چھاچھ کو بھی پھونک کر پیتا ہے۔وہی بات ہمارے ساتھ بھی تھی۔

پیزا کے ساتھ جوس بھی مزے کا تھا۔10 یورو بل کا حساب وہیں میز پر ہی سینٹ اور یورو میں ہوگیا۔اب کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے سے پوچھا کہ اس وقت ہم کہاں جاسکتے ہیں؟

پیازہ نیوا nueva یہاں قریب ہی ہے۔لڑکے نے نقشہ کھول کر ہمارے سامنے کیا۔یہ سپینش میں تھا۔تاہم اُس نے اُس جگہ کو گول سرکل کیا جہاں ہم کھڑے تھے۔

غرناطہ کا قدیم ترین مرکزی حصّہ تاریخی عمارتوں اور تاریخی ورثے سے سجا۔شکر ہے عربی نام غرناطہ کا بگاڑ بس تھوڑا سا ہی ہوا۔ہسپانوی گرنطہ Garnata کہتے ہیں۔اور جب ہم اُس گلی سے گزرتے تھے جس کے آخری کونے پر نیوا سکوائر شہر کا مرکزی حصّہ تھا۔میں تاریخ کے بہاؤ میں بہہ رہی تھی۔غرناطہ کا سقوط ایسے ہی نہیں ہوا تھا۔کہ اِسے مسلمانوں کی نالائقی ،نااہلی ،اُن کی عیاشیوں کے زمرے میں ڈال دیا جائے۔یہ عیسائیوں کی منظّم ،متحد اور مسلسل فوجی مہمات کا نتیجہ تھی۔قدرت کے فیصلے ہمیشہ میرٹ پر

ہوتے ہیں۔

مجھے ڈاکٹر عمر عادل کی بات یاد آئی تھی۔ بہتر رہے گا غرناطہ کو اس کے الگ الگ ٹکڑوں میں دیکھو۔

اب آئے ہیں تو دیکھتے ہیں۔

نیوا Nueva پلازہ ہمارے سامنے تھا۔ دل کش منظروں کے جُھرمٹ میں ڈوبا ہوا۔ ذرا سے فاصلے پر پلازہ سانتا اینا بھی نظر آیا تھا۔

ہم نے وہاں بیٹھنا، منظروں سے آنکھیں سیکنا اور کافی سے دل بہلانے کو ترجیح دی۔ پھر اٹھے بس پر چڑھے اور پلازہ دی ازابیل جا اُترے۔

پلازہ دی ازابیل میں گو کہنے کو خوبصورت بالکونیوں اور جدید رنگ کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ پلازے کی کشادگی پھولوں اور پودوں کا حسن بہت وافر مقدار میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مگر اِس پلازے کی سب سے بڑی خوبصورتی اور رعنائی ایک قد آور مجسمے کی ہے۔

سکوائر میں داخل ہوتے ہی یہ سب سے پہلے آپ کی نظروں کو اپنے حصار میں لیتا ہے۔ گرینائٹ کے بلند و بالا پیڈسٹل پر دھرے رومن کیتھولک عقیدے کی حامل ملکہ جو تاریخ میں ازابیلا کے نام سے جانی جاتی ہے۔ شہرہ آفاق سمندروں کا مسافر کولمبس اس کے سامنے کھڑا فرمان حاصل کر رہا ہے۔ مجسمہ ساز کا کمال دیکھئیے کہ اُس نے تاریخ کے جس عظیم فیصلے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہا۔

ازبیلا اس عظیم ملاح کو بتاتی ہے کہ وہ اس کی اِس مہم کے اخراجات کا سارا بوجھ اُٹھائے گی۔

موتیوں کی دھاریں برساتے اِس پلازہ ازبیلا لا کیتھولک۔ کولمبس سکوائر۔ تاہم غرناطہ کے لوگوں نے بھی کھوٹے کھرے میں پہچان کا ثبوت دیا۔ ہم لوگ جب پلازہ ازابیلا

کی رٹ لگائے ہوئے تھے۔لوگوں نے مونڈھے مارے۔ہاں البتہ ایک نے مشکل سمجھی اور کولمبس سکوائر کہا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ پیسے کی فراہمی تو Valencian کے یہودی نے یقینی بنائی تھی۔جس کا نام پیڈسٹل پر کندہ ہے اور جسے کبھی پیسے واپس نہیں کیئے گئے۔ بلکہ چند ماہ بعد بیچارے غریب آدمی کو سپین کے بقیہ سب یہودیوں کے ساتھ دیس نکالا بھی دے دے گیا۔

اِس سارے منظر کا حقیقی ہیرو تو کولمبس ہی تھا۔ہاں البتہ ازبیلا کے سامنے اُس کے کارنامے کی چمک دمک ماند پڑی نظر آتی ہے۔ جب تک کہ اندر کی کہانی سامنے نہیں آتی۔ یہ حسین منظر تھا کہ پتھر کی چوڑی پختہ دیوار کے ساتھ ساتھ ندی The Famous Paseo de los Tristes بہتی ہے۔سبزہ کی کثرت آنکھوں کو تازگی اور سرور بخشتی ہے۔ بارشوں نے ہر چیز کا چہرہ نکھار دیا تھا۔سڑک اور ندی کے ساتھ دورویہ مکان دوادوارا اور دوتہذیبوں کی داستان سناتے ہیں۔

اوراس چلنے کے ساتھ ساتھ اردگرد کے منظروں سے لطف اندوزی بھی ہورہی تھی۔تھوڑی تھوڑی سی دیر بعد سیدھا سیدھا راستہ ایک موڑ مڑتا اور ایک نیا راستہ ایک نیا منظر اپنا آپ سامنے کھول دیتا۔ کچھ نیا، کچھ انوکھا، کچھ مبہوت کرنے والا، آنکھوں میں مسرت وخوشی کی کرنیں بھرتا ہوا اور دل کو مسرور کرتا ہوا۔اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔فضا میں خنکی بھری ہوئی تھی اور رکی ہوئی بارش کا سلسلہ چپکے چپکے سے ایک پیغام دے رہا تھا کہ اٹھ جاؤ آج ساری رات مجھے برسنا ہے۔تم پردیسیوں کے ٹھکانے پر بس پہنچنے کا منتظر ہوں۔ اور سچ مچ ایسا ہی ہوا تھا کہ جونہی واپس آئے۔ مینہ برسنا شروع ہوا یوں کہ ساری رات برستا رہا۔

☆☆☆

باب نمبر:4 اُندلس کی دُلہن

- اُندلس کی اس دُلہن غرناطہ کا اولین شب چھم چھم رونا دھونا ہی سُنا۔
- البیازین عرب تہذیب وثقافت کا گڑھ ہے۔
- غرناطہ میں داخل ہونا گویا اپنے کسی محبوب خواب کی تعبیر تھی۔

ہوم گرینیڈ اسرتا پیر سیمنٹ، سریا اور فائبر گلاس کی چھتوں سے ڈھنپا ہوا تھا۔کہیں کوئی چھوٹی موٹی سی موری بھی نہ تھی کہ بندہ جھانک کر ہی دیکھ سکتا کہ مہر و ماہ کس حال میں ہیں۔ساری رات اپنی زبان میں کہوں تو پرنالے بہنے والی بات تھی۔جب جب رات میں آنکھ کُھلی اِس اُندلس کی دُلہن کا رونا دھونا ہی سُنائی دیا۔

تیار ہوئے تو سرفہرست ایک تگڑا سا ناشتہ کرنے کا اعلان ہر جا سے ہوا کہ الحمرا کے ٹکٹ کے لیئے لائنوں میں لگنے کے لیئے بہرحال توانائی کی ضرورت تھی۔

باہر نکلے تو شُکر اُشُکر اُ کہا کہ آسمان کی صورت بڑی بجھی سی تھی۔نکڑ پر پہنچے تو اِس اجنبی دیس کے ماحول پر بکھرے سحر نے قدموں کو روک سا دیا۔پارک کے درختوں کا بانکپن اور طلائی کرنوں کا عمارتوں اور پیڑوں کی چوٹیوں کو سنہرے رنگ میں رنگنے دیکھنا دلفریب تھا۔

اور جب شوکیسوں میں سجے جام شہد لگے بند کیک دیکھتے تھے جن کے مشکل مشکل نام اُس موٹی سی ویٹرس کے بتانے کے باوجود بھی ہمارے سروں سے ہوا کی طرح گزر رہے تھے۔ہم تینوں کو پراٹھے آملیٹ یاد آئے تھے۔''ہائے'' یہ غریب الوطنی کا نعرہ ہم نے بالکل

نہیں لگایا کہ اس کے لیئے ہماری دعاؤں کے پلندے اوپر والے کے پاس محفوظ تھے اور ہمیں پھٹکار پڑنے کا خوف تھا۔

ناشتہ باہر درختوں کی چھاؤں میں کیا اورنج جوس کے دو دو گلاسوں کے ساتھ اور زالوفون پر ایک مانگنے والے لڑکے کا گیت سُنتے ہوئے۔

خدا کیسا سبب اسباب ہے۔ایک موٹے سے بندے کی طرف سے ایک پلیٹ میں Complimentry پیش آیا۔واہ مولا واہ تیرے رنگ۔تو ہی رازق تو ہی مالک۔دوپہر کے لیے پردیسیوں کو من وسلوٰی کا تحفہ۔فوراً ٹشو پیپرز میں لپیٹ بیگ میں گھیسڑ لیا کہ لنچ کی ڈنڈی مارنی ہے۔

جب بل کی ادائیگی کے لیے اندر گئے۔سیما اپنا ٹکٹ والا پٹارہ یہاں بھی کھول بیٹھی۔لڑکے نے قریبی بینک جانے اور وہاں سے ملنے کی نوید دی۔لیجیئے مار دھاڑ کرتے وہاں گئے۔ہم تو اپنے ہاں کے رونق میلے والی آوت جاوت اور رنگ رنگیلے سے بینک ماحول کے عادی تھے۔یہاں تو اُلّو بولتے تھے۔ہونق سا ایک آدمی بیٹھا نظر آیا۔جس نے ہماری درخواست سُنتے ہی پھٹکار کے سے انداز میں کریڈٹ کارڈ کی رٹ لگائی۔تھوڑی دیر مغز کھپائی کے بعد دو حرف لعنت کے اس پر بھیجتے ہوئے باہر نکلیں۔

''اپنی ٹانگوں پر بھروسہ کرو۔چلو سیدھی طرح لائنوں میں لگو جا کر۔اتنا ڈھیر سارا کھایا پیا کِس لیئے تھا۔اسی کشٹ کو کاٹنے کے لیئے نا۔''

اِدھر اُدھر بسوں اور میٹرو کے تجربات کرنے کی بجائے ہم نے سیدھے سیدھے ٹیکسی کا سوچا کہ اِس مختصر سے عرصے میں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سپین کے ٹیکسی ڈرائیور ڈنڈیاں نہیں مارتے ہیں۔کرایہ بہت معقول ہوتا ہے اور تین لوگوں پر تقسیم ہو کر بہت سستا پڑ جاتا ہے۔

الحمرا میں ہسپانیوں نے ب کا اضافہ کرلیا ہے۔گاڑی خوبصورت کشادہ اور کہیں تنگ تنگ گلیوں سے گزرتی شہر کی پشت پر سائبانوں کی طرح کھڑی سیرا نویدا پہاڑیوں کی جھلک دکھاتی ہمیں الحمرا کے گیٹ پر لے آئی تھی۔کرایہ کوئی 10 یورو بنا تھا۔فی کس سوا تین۔

پہلے چند لمحے تو جذباتی کیفیت میں گزرے۔

''ہم اور غرناطہ ارے ہم اور الحمرا۔ زمانوں کا خواب مولا تیرا شکر مولا تیرا احسان۔''

پتھروں سے بنے راستے پر چلتے ہوئے دو تین بار لڑکھڑائی تو جیسے الحمرا نے سرگوشی کی۔

''یہ تو عاشوں کے امتحان لینے کے لیئے بچھائے ہوئے ہیں کہ انہی پتھروں پر چل کے اگر ہو سکے تو آؤ۔تم تو سچ مچ بڑی سچی عاشق نکلی۔آ گئی ہو۔''

''چل جھوٹے کہیں۔ایک دنیا تیرے عشق میں دیوانی ہوئی پڑی ہے۔پاگلوں کی طرح تیری طرف دُھڑکیاں لگارہی ہے۔اب تیری گھونگھٹ اٹھوائی کہوں یا منہ دکھائی کہوں۔تم ہی فیصلہ کردو۔پیسے ہاتھوں میں لیئے پھرتی ہوں۔کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔سیما اور میرے جیسی بے چاریاں کس گنتی شمار میں۔دیکھنا یہاں تیرے دروازے پر آ کر بھی بے حال ہیں کہ اوائل عمری کے اِس عشق کا کیا کریں جس نے سدا مضطرب رکھا۔باقی ناشکری نہیں ہوں۔مانتی ہوں اُس نیلی چھت والے کا احسان۔''

ذرا آگے بڑھے تو دیوار سے ٹیک لگائے شلوار قمیض میں گوری سی خاتون کو دیکھا۔پاکستانی تو وہ سر سے پیر تک دِکھتی تھی۔اندر سے سوال ہوا۔پر کہیں مشرقی پنجاب سے ہوئی تو۔

تو کیا؟ میں نے اندر والے کولتھاڑا۔خوش ہی ہوگی کہ اس اجنبی فضا اور ماحول میں کِسی نے پوچھا۔کِسی نے اپنی زبان میں بات کی۔

پتہ چلا کہ وہ پاکستانی ہے۔پشاور سے ہے۔الحمرا کے ٹکٹ نہیں لیئے تھے۔یہاں آئے تو پتہ چلا کہ وہ لائنوں وائنوں والا سلسلہ کہیں نہیں ہے۔سب ختم۔انٹرنیٹ کی پردھانی ہے۔ایک چانس ہوٹل والوں کی خوشامد ہے کہ وہ اگر ترس کھا کر دوگنی قیمت پر دے دیں۔شوہر ہوٹل والوں کے طرلے منتیں کرنے گیا ہے اور اسے یہاں بٹھا گیا ہے۔

''لوبھئی کر لوگل۔''میں نے سیما اور مہرانساء کی طرف دیکھا۔

بھاری بھر کم ناشتے اور لائنوں میں لگنا سب حرام ہوا۔پر سیما نے کہا۔آگے تو چلو یہیں ٹھیری ٹا بیٹھی ہو(یعنی ہمت ہار بیٹھی ہو۔)خود پتہ کرتے ہیں۔

اب جو دیکھا تو آنکھیں پھٹیں۔پورا میدان بھانت بھانت کے لوگوں اور بولیوں سے بھرا پڑا تھا۔ٹکٹ آفس جا کر پوچھا۔وہاں تو کچھ وہ حال تھا کہ جس کے لیئے کہا جائے کہ ہم تو اپنی ذمہ داری مشینوں کو سونپ کر بڑے مزے میں ہیں۔اب تم جیسے اناڑی لوگ بھاڑ میں جاؤ۔ہمیں کیا۔

سیما تو جیسے غش کھا کر گرنے والی تھی۔کہ لوبھئی یہ کیا بنا؟اب غرناطہ آکر الحمرا دیکھے بغیر چلے جانا تو کچھ ایسا ہی ہے نا جیسے بندہ آگرہ جائے اور تاج محل نہ دیکھ سکے۔

اُسے تسلی دلاسا کے لفظوں سے''دیکھو ہوٹل والوں کی اتنی تو مٹھی چاپی کی ہے۔اب جا کر قدموں میں پڑ جائیں گے۔''

تاہم میرے اندر ایک کمینی سی خوشی بھی رقصاں تھی۔کمبخت اس وقت کِسی اڑیل ٹٹو کی طرح اکڑی بیٹھی تھی۔مالک دہائیاں دیتا تھا کہ اپنے کریڈٹ کارڈ پر بکنگ کروا دیتا ہوں۔میں پل پل فون کرتی تھی۔سُنتی نہیں تھی۔فلاں یوں کہتا ہے۔ڈھمکانا یوں۔لے اب

چکھ مزے۔

سوال تو یہ تھا کہ اب پردیس میں کنجر چھنج تو نہیں ڈالنی تھی نا۔بس بہلا پھسلا کر کافی شاپ کے سامنے بنی سنگی چوڑی بینچ پر لے آئی۔دھوپ میں ممتا کی گود جیسا نگھ اور گرمائش تھی۔ ہمارے ہاں ایسا موسمی لُطف جنوری میں ملتا ہے۔

کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے ہم نے ممکنہ امکانات پر سنجیدہ بات کی۔ہوٹل ہی آخری امید تھی۔ناکامی کی صورت میں قیام بڑھایا جائے۔آخری جملہ کی تان اسی پر ٹوٹنی تھی نا کہ بھئی اللہ پر بھروسہ رکھو۔اٹھو اور سامنے شاپ کا دیدار کریں اور باہر نکلیں۔

غرناطہ کیا یہاں سپین کے شہروں میں بننے والے چھوٹے اور بڑے سوونیرز موجود تھے۔کتابیں تھیں۔ڈی وی ڈی اور کیسٹیں سبھی کچھ تھا۔ واشنگٹن اروِنگ Washington Irving کی Tales of the Alhambra اٹھا کر پھولا پھرولی کی۔ قیمت پوچھی اور ابھی تو یہاں آنا ہی ہے۔خریدنا ہے اِسے۔ کہتے ہوئے باہر آ گئی۔

سیما کا کہنا تھا کہ اِس وقت بارہ بج رہے ہیں۔ہمیں واپس جا کر ٹکٹوں کا پتہ کرنا چاہیے تاکہ اس کے مطابق اگلا لائحہ عمل طے ہو۔

مجھے غصہ آیا۔''اب اِن آنیوں جانیوں کے چکروں میں ہی رہیں گے۔ٹکٹ لازماً آج کے تو نہیں کل کے ہوں گے۔شام کو جائیں گے تو دیکھ لیں گے۔

میں غرناطہ کی اُس مسجد کو دیکھنے کی متمنی تھی جو میری یادداشتوں میں ایک پُرلُطف اور خوبصورت یاد کی طرح محفوظ تھی۔

آٹھ جولائی 2003 کا یہ حبس آلود سا دن تھا۔دن جمعرات کا تھا۔اخبارات اور

ٹی وی نے ایک ایسی خبر نشر کی تھی جس نے موسم کو دلآویزی اور رعنائی دے دی تھی۔جس نے آنکھیں گیلی کر دی تھی۔جس نے جذبات کے مدّ وجزر میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔جس نے انگ انگ میں سرشاری دوڑا دی تھی۔ میں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں ننگے سر کھڑی تھی۔ بھاگ کر کمرے میں گئی تھی۔ڈوپٹے سے سر ڈھانپتے ہوئے واپس ٹی وی لاؤنج آئی تھی۔

خبر الجریزہ ٹیلی ویژن لائیو نشر کر رہا تھا۔غرناطہ کی اِس نئی تعمیر شدہ مسجد کے موذن کا مینار پر چڑھنا اور نصف ملنیئیم کے طویل عرصے بعد اللہ اکبر کی صدا کا گونجنا کیسا ایمان افروز واقعہ تھا۔

اس کو بنانے کے لئیے کتنا انتظار کرنا پڑا۔اس کی تفصیل بڑی لمبی ہے۔درخواست گزاری کی اس مہم میں نہ صرف مسجد کا مطالبہ تھا بلکہ اس کا مرکزی مطالبہ سیان نکولس چرچ کی واپسی تھی جو صدیوں پہلے ہسپانیہ کے موروں کی مسجد تھی۔ جسے سقوط غرناطہ کے بعد چرچ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

تعریف وتحسین کے لفظ بہت چھوٹے ہیں اُن پندرہ سولہ ہزار ہسپانوی مسلمانوں کے لیے جن کے اندر عزم صمیم کی لو اُنہیں سرگرم رکھتی تھی۔ مسلسل جدوجہد، مسلسل کوشش۔حکومتی سطح پرارکان کی مخالفت بہت شدید تھی۔

تاہم ایک وقت ایسا آیا کہ سیاسی طور پر مسلسل بلند ہونے والی اِس آواز کو دبانا مشکل ہو گیا تھا۔ یواے ای شارجہ کے حکمران نے اِس کے کم وبیش سارے اخراجات اٹھائے تھے۔

نصف صدی سے بھی زیادہ کی کاوش کا یہ حسین تحفہ اس کی خوبصورت اپنی طرز کے منفرد اکلوتے مینار کی چھوٹی سی جگہ پر جب موذن نے اللہ اکبر کی صدا لگائی تو غرناطہ کی

پہاڑیوں، غرناطہ کے میدانوں، اس کی ہواؤں، اس کی فضاؤں میں وہ آواز گونجی تھی جسے سُنتے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے تھے۔

اور اس وقت جب وسط اکتوبر کی میٹھی اور خنک سی دوپہر میں ہم گیٹ پر کھڑی سوچتی تھیں کہ ٹیکسی پکڑیں یا وہ ہوپ ان اور ہوپ آف لیں۔ کیونکہ آہنی سنگلوں سے جڑے اس کے سبز رنگے فنّی Funny تین ڈبوں والی ٹرین سے تو ہم کل ہی متعارف ہو گئے تھے۔

تھوڑی سی سوچ و بچار نے فیصلہ ٹیکسی کے حق میں دیا کہ ٹیکسی ٹھک سے مطلوبہ مقام پر پہنچا دے گی۔ اور اس وقت جب نصف دن گزر چکا تھا۔ ہوپ آن ہوپ آف کا ڈیلی ٹور لینا ٹھیک نہیں رہے گا۔

ہمارے ایک طرف اگر قلعہ کی عظیم الشان بیرونی دیوار ہمیں اس کے ماضی سے روشناس کرواتی یہ بتاتی تھی کہ قلعہ تو محمد بن الاحمر کی تعمیر سے پہلے بھی موجود تھا۔ اُس نے اِسے وسعت، جدّت اور نیا رنگ دیا۔ برجوں کو دیکھتے ہوئے فصیل کی رنگت میں گھلی دیسی پیاز کی پرت والی سرخی اس کے نام ''الحمرا'' کے بارے روایت کرتی ہے کہ اسے اِس نام سے پکارنے کی ایک وجہ یہ ہے۔ تاہم اِسے محمد بن الاحمر سے بھی جوڑ سکتے ہیں۔

ٹیکسی کی رفتار کو ہم نے جوں جیسی کرنے کی درخواست کی تھی۔ ڈرائیور بیبا لگتا تھا۔ باڈی لینگویج سے سمجھ کر حسبِ خواہش رفتار پر گاڑی لے آیا تھا۔ واچ ٹاورز کی بلندیوں میں یقیناً سطوت ماضی کی کوئی جھلک جیسے اپنا عکس سا لہرا جاتی تھی۔

تصورات کے گھوڑوں کا کیا ہے وہ تو ذرا سا ماحول ملنے پر سرپٹ بھاگنے لگتے ہیں۔ یہی اس وقت ہو رہا تھا۔ کبھی محل میں اس کے شب و روز کے کسی رومانوی سے منظر کا کوئی عکس دکھائی دینے لگتا۔

یہ خزاں کے دن تھے جب غرناطہ آنا نصیب ہوا تھا۔ پتوں نے کتنے رنگوں کے پیرہن پہن لیے تھے۔ چناروں کے قدیمی درخت سرو اور شاہ بلوط کے بلند و بالا پیڑ دونوں جانب کی خوبصورتی کو بڑھاوا دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں جانے کہاں کہاں اڑائے پھرتے تھے۔

ماحول ایک خوش کن اور لطیف سے سناٹے میں ڈوبا ہوا متوجہ کرتا تھا۔ کہیں کچا راستہ باغات یا کسی جنگل میں اتر رہا تھا۔ ایک جوڑا ایک دوسرے کی بانہوں میں ہاتھ ڈالے گھاٹی میں اترتا نظر آیا تھا۔ فضا میں ایک مانوس سی خوشبو تیر رہی تھی جس میں زور زور سے سانس لینا اچھا لگتا تھا۔

پرندوں کے غول نیلے آسمان کی وسعتوں میں اڑتے پھرتے منظر کے حُسن میں اضافہ کرتے تھے۔

نالیوں میں بہتا پانی روڑوں اور سنگ ریزوں سے ٹکراتا خاموشی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ دفعتاً ایک ایسا منظر ہماری بصارتوں سے ٹکرایا جس نے مجھے فی الفور ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیا۔ سامنے موڑ تھا اور نیچے غرناطہ بکھرا ہوا تھا۔ اتنا موہ لینے والا نظارہ۔

بے حد وضعدار آدمی تھا۔ سمجھ گیا تھا کہ بیبیوں کی نظریں کہیں اور اُلجھ گئی ہیں۔ تصویریں بنائیں۔ کچھ آگے جا کر ایک جانب مڑتے ہوئے اس نے بتایا Sacromonte میرے اس طرف ہے اور Al-Baicin اِس سے ذرا پرے۔

بس دونوں جگہوں پر طائرانہ سی نگاہ ڈالنے والی بات ہی تھی۔ دونوں جگہوں بارے ابھی صرف کتابی علم ہی تھا کہ البیازین دراصل قدیم عرب بستی تھی۔ یہاں عرب مسلمان آباد تھے۔ عرب تہذیب و ثقافت کا گڑھ تھی یہ بستی۔ مگر یہ

Sacromonte کون ہیں؟جب کتاب کھولی تو معلوم ہوا کہ وادی Valparaiso جو کہ عین الحمرا کے سامنے واقع ہے۔دریائے دارو Darro کے دونوں کناروں پر آباد یہ بستی جو غرناطہ میں اس وقت آباد ہوئے جب عیسائیوں نے یہ علاقے مسلمانوں سے چھین لیئے تھے۔اسے بالعموم جپسی کواٹرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ان کے بارے بہت سی روایات ہیں۔کہیں یہ غاروں میں رہنے والے بے حد سیاہ فام لوگ کہے گئے۔کہیں خانہ بدوش لوگ سمجھے گئے۔دراصل آغاز تو ان کا کہیں غاروں میں ہی رہنے سے ہوا تھا جو وقت کے ساتھ معاشرت کی تبدیلیوں سے گھروں میں بدلتے گئے۔

سولہویں صدی میں ان کی ایک معقول تعداد الحمرا کی مخالف سمت کی پہاڑیوں میں آباد ہوتی چلی گئی۔یہ بڑے آرٹسٹک لوگ تھے۔جنہوں نے رقص، پینٹنگ اور کھانوں میں نئے رنگ، نئے انداز اور نئے ذائقے روشناس کروائے۔

آج یہ قوم ایک حسین اور تابندہ روایت کی حامل ہے جو سیاحوں کے لیئے حد درجہ تفریح کا باعث بنی ہوئی ہے۔غرناطہ کی پہاڑیوں پر رات ہونے پر ان کی وہ غاریں جھلملا اٹھتی ہیں جو کبھی اِن کی رہائش گاہیں تھیں اور اب آمدنی کے ذرائع ہیں۔اِن غاروں میں عجائب گھر،اور ان کی مقدس چیزیں ہیں۔

ڈرائیور کی مہربانی کہ وہ ہمیں کشادہ گلیوں سے گزارتا مسجد کے سامنے لے آیا تھا۔قدیم مورش تہذیب کی نمائندہ مسجد جو زمانوں سے خوابوں میں بسی تھی۔

اس وقت ایک بج رہا تھا۔سیاہ آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔دعائیں ہونٹوں پر تھی۔پہلے ہم نے گھوم پھر کر جائزہ لیا۔درختوں سے گھری خوبصورت روشن اور فوارے سے سجی اپنی پشت پر الحمرا اور پہاڑوں کے منظر دکھاتی کیسی دل کو بھائی تھی۔ہم لوگ

فوارے سے آگے دیوار کے ساتھ جا کر کھڑے ہو گئے۔

اور جب اذان کی آواز گونجی۔ یہ وجد کی سی کیفیت تھی جو ہم پر طاری ہوئی۔ مسجد کی بیرونی تزئین اور جائے وضو وغیرہ پر نیلا سنگ مرمر استعمال ہوا ہے۔کیا اس کی مناسبت استنبول کی نیلی مسجد سے جوڑنے کی کوئی خواہش پسِ پشت ہے۔

وضو کے بعد اندر داخل ہوئے ایک روح پرور منظر ہمارا منتظر تھا۔حددرجہ خوبصورت اور پرکشش محراب ومنبر بھی اپنی نوعیت میں منفرد لگے۔نماز ادا کی۔کرسیوں پر بیٹھ اور کھڑے ہوکر۔مگر اختتام پر ہم نے خود کو بے حد خوبصورت مخملین فرش پر گراتے ہوئے پیشانی اس پر ٹکا دی۔شکر تھا۔دعائیں تھیں۔اور گہری عبودیت کا اظہار تھا۔

اس کے فوارے والے حصّے میں دھوپ میں بیٹھنا اور ماحول کو دیکھنا بڑا مزے کا کام تھا۔نیلے آسمان کا پر ہیبت سا پھیلاؤ ،سبزے کی ہریالی کا حسن،عمارتوں کے چہرے مہروں پر سجی سفیدی،راستوں کا ٹیڑھا پن ،تکونوں ، زاویوں اور مثلثوں کی صورت نظر آتا سب دل لبھاتا تھا۔

پلازہ سان نکولس کے کشادہ ٹیرس کی بنی پر بیٹھنا،موروں کے اِس شاہکار محل کی برجیوں، میناروں کو چمکتے سونے جیسی دھوپ میں دیکھنا اور عقب میں سیرا نویدا کے کہیں کہیں برف میں ڈھنپے پہاڑوں کو سائبانوں کی طرح مستعد محسوس کرنا جیسا مسرور کرنے والا کام بھی ہم نے وقت کی قید سے جیسے بے نیاز ہوکر کیا۔

اوپر والے کی احسان مندی تو ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بھلا جو جگہ بل کلنٹن کی یادوں میں کھلبلی مچاتی رہی ہو اور جسے وہ دنیا کا بادشاہ بن جانے پر بھی دیکھنے کے لئے آئے کہ وہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں یہاں آیا تھا اور اِس سے بہت متاثر ہوا تھا۔اب ایسے میں ہمیں بھی اچھی لگنی چاہیے تھی۔اب سچی بات ہے اچھی تو ضرور لگی مگر شاعرانہ لفظوں کا

سہارالوں تو کہنا پڑے گا کہ سارا منظر کسی شاہکار پینٹنگ کی طرح لگتا تھا کہ جسے دیکھتے جاؤ اور دل نہ بھرے۔

حسین اور موہ لینے والا تو سب کچھ تھا مگر پس منظر میں جو دکھ اور کرب تھا اس کا احساس تو اِس دل کو ہی تھا کہ چرچ تو کبھی مسجد تھی جہاں سجدہ دیا جاتا تھا اور درختوں سے سجا یہ کشادہ سا پلازہ کبھی قلعہ تھا۔ Alcazaba Kadima جس کا کوئی ٹوٹا پھوٹا نشان تو نظر آتا ہے۔ باقی سب صفایا ہو گیا ہے۔

دراصل Alcazaba کے ساتھ بھی تو بڑی تلخ سی یاد وابستہ ہے کہ جب غرناطہ کا سقوط ہوا تو پہلا کام تو گھنٹی کا نصب کرنا تھا جو رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق ایمان کا حصّہ ہے۔ لاویلا اسی کو کہتے ہیں۔

2 جنوری کو گھنٹی کا بجنا 1492 غرناطہ کو واپس لینے کا دن ہے کے طور پر منایا جاتا ہے۔

میں تو سوچے بیٹھی تھی کہ اب البیازین کے گلی کوچوں میں بھی اُتر جائیں۔ جتنا دیکھ سکتے ہیں دیکھ لیں۔ کہیں کھانا وانا بھی کھالیں مگر سیما مصر تھی کہ چار بج رہے ہیں۔ واپس چلو۔ کچھ پتہ تو چلے۔ ہمارا بنتا کیا ہے۔

کہیں کھانا کھالیتے۔ مہرالنساء نے رائے دی۔

وہیں ہمسائے والے ریسٹورنٹ میں ہی کھائیں گے۔

اب جب ایک بندہ ایسی بے تابی و شتابی پر اُتر آئے تو سرِخم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ مارومار کرتے جب گرینیڈا ہوم میں داخل ہوئے تو دفتر میں دو نئے چہرے نظر آئے۔ نہ نکولس تھا اور نہ ہی مسٹر سیلواڈور نظر آرہا تھا۔

تابڑ توڑ سوالات ۔کہاں ہیں وہ دونوں۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے ہمارے خادم

ہوں۔

دیکھو سیما تمہارے چہرے پر دوڑتی لالی تمہاری آواز کی جھنجھاہٹ اور تمہارے ہر انداز سے ٹپکتا اضطراب بتا رہے ہیں کہ تمہارا بلڈ پریشر شوٹ کر رہا ہے۔خدا کے لئے خود کو نارمل کرو۔ہم پردیس میں ہیں۔یاد رکھو۔جو خدا ہمیں دکھا رہا ہے اس کی عنایت اور جو نہیں دکھائے گا اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت۔

آؤ کھانے کے لئے چلیں۔

☆☆☆

باب نمبر:5 غرناطہ کا بیٹا گارلوشیالوکا، سپین کا ایک عظیم شاعر، ایک توانا انقلابی آواز، کامیاب ڈرامہ نویس اور مصور

- سپین نے اپنے ہیرو کے لیے شہر کا ایک حصّہ وقف کر رکھا ہے۔
- اُسے موسیقی سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔
- ہسپانوی ورثے کی قدامت اور جدّت کی آمیزش نے شاعر کے کلام اور تحریر کو ایک انفرادیت دی۔

غرناطہ کے اس ہوم گرینیڈا کے چھوٹے سے کمرے میں موجود تین پاکستانی عورتوں اور دو ہسپانوی مردوں نکولس اور سیلواڈور کے باوجود موت کی سی ظالمانہ خاموشی طاری تھی۔ سچ تو تھا کہ ہمارا تو وہ حال تھا کہ بادی النظر میں تو بظاہر چپ چاپ کرسیوں پر بیٹھے تھے مگر اندر خانے صورت کچھ اسی انداز کی غماز تھی۔ کہ جیسے پچھاڑ کھا کر اوندھے منہ گر پڑے ہوں۔

تاہم خود پر لعن طعن اور پھٹکار کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری تھا کہ جب انٹرنیٹ پر بکنگ کے جدید طریقے کو کوئی اہمیت نہیں دینی۔ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ الحمرا کے لیئے سبھی دن بک ہیں۔ ایسی فضول یاوہ گوئیوں سے دل کو بہلانا ہے۔

’’تو کیا ہوا؟ ارے بھئی لائنوں میں لگ جائیں گے۔ ہوٹل والوں کی منت طرلہ کرلیں گے۔ ہو جائے گا کوئی نہ کوئی بندوبست جیسے خود فریبی والے لچھن ہوں گے تو پھر یہی کچھ ہوگا جو ہمارے ساتھ ہوا تھا کہ پہلے تو الحمرا کے گیٹ پر ہی دربانوں نے جھنڈی دکھا

دی۔

''ارے جاؤ بیبیو عیش کرو۔ وہ لائنوں والا سلسلہ تو اِس سال سے ختم ہو گیا ہے۔''

ہوٹل والوں کی منت سماجت اور بلیک میں ٹکٹ خریدنے کی پیشکش کا بھی دو دن بعد حشر دیکھ لیا کہ ابھی ابھی چٹا کورا جواب ملا تھا'' کہ بھئی ہفتہ بھر سے پہلے تو ناممکنات میں سے ہے۔''

تو اب مایوسی کی انتہاؤں کو چُھونا سمجھ میں تو آتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دُکھی سے لہجے میں سیما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چلو اٹھو گارشیا لورکا Garcia Lorca کا میوزیم تو دیکھ آئیں۔ اس کی شاعری پر کتابیں بھی ڈھنڈونا ہیں ابھی۔''

دفعتاً نوجوان نکولس نے اپنی نگاہیں کمپیوٹر سکرین سے اٹھا کر میرے چہرے پر جمائیں اور بولا۔

''گارشیا لورکا۔ جانتی ہیں اُسے؟

میں بھی جیسے تپی بیٹھی تھی۔ مزاج کے برعکس طنزیہ لہجے میں پھٹ سی پڑی۔

''شرطیہ کہہ سکتی ہوں تم سے تو زیادہ ہی جانتی ہوں گی۔''

سیما نے البتہ متحمل انداز میں بات کی۔

''مدّاح ہیں اُس عہد ساز شخصیت کے۔ اس کا شمار اپنے دور کے اُن بین الاقوامی سطح کے اُن صاحب طرز ستائیس (27) افراد کی فہرست میں بہت نمایاں ہے جن میں شعرا کی اکثریت تھی اور جنھوں نے یورپ میں جنم لینے والی ان سب تحریکوں جنھوں نے مصّوری کو اصولوں اور تحریر میں تمثیل نگاری کو رواج دیا تھا۔ دراصل ہسپانوی ادب میں نئے رجحانات کا در آنا اسی گروپ کا مرہون منت تھا۔

اُدھیڑ عمر سیلواڈور Salvador اور نکولس دونوں نے ایک دوسرے کو گہری نظروں سے دیکھا تھا۔مسٹر سیلواڈور کی اب نظروں کا زاویہ بدلا اور میں ان کی گرفت میں تھی۔اُن نظروں میں جو سوال ابھرا تھا وہ میری سمجھ میں آیا تھا۔

’’رائٹر ہیں ہم لوگ۔اُندلیسیہ (Andalusia) کا تعمیراتی حسن اگر پورے یورپ میں سپین کا سر بلند کرتا ہے۔الحمرا غرناطہ کے حسن کا چرچا ہے تو غرناطہ کا وہ بیٹا بھی باعث فخر ہے۔‘‘

’’آپ لوگوں نے بکنگ کروائی ہوئی ہے وہاں کی۔‘‘ پوچھا گیا۔

خجالت اور شرمندگی کے کسی احساس کا اظہار کرنے کی بجائے میں نے ذرا ڈھٹائی سے کہا۔

’’وہاں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔‘‘

ملکوں ملکوں کے ادیبوں، شاعروں کے میوزیم دیکھنے کے تجربات کا زعم تھا میرے لہجے میں۔

اور پھر جیسے انہونی سی ہوگئی۔نکولس نے کہا۔

’’الحمرا کے ٹکٹ آپ شام کو لے لیجئیے گا۔چاہتی ہیں تو فوری ادائیگی کر دیں وگرنہ شام کو سہی۔‘‘

ارے ہمارے تو منہ کُھلے کے کُھلے رہ گئے۔چند لمحوں کے لئیے سماعتوں پر دھوکے کا سا گمان گزرا پھر جیسے باچھیں کھل کر ہمارے کانوں تک جا پہنچیں۔

’’لو بھئی یہ تو معجزہ ہوگیا۔یقیناً گارشیا لورکا کے نام نے کھل جا سم سم والا کام کر دکھایا تھا۔یا ہمارے رائٹر ہونے کو احترام ملا تھا۔کچھ تو تھا کہ برف پل جھپکتے میں پگھل گئی تھی۔اللہ جانے مولا جانے۔

اور ہاں پیسے تو ابھی لو۔اسی وقت بھئی شام کا کوئی بھروسہ نہیں۔‘‘

گٹھلی کا منہ کھولا۔پچاس یورو کے تین نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیئے۔مسٹر سیلواڈور مسکرائے۔تین میں سے ایک نوٹ اٹھایا اور بولے۔

’’ٹکٹ چودہ یورو فی کس کے حساب سے۔‘‘

بقیہ آٹھ یورو کے سکے ہمیں تھما دیئے۔

’’موجیں ہوگئیں بھئی موجیں۔گارشیا لورکا کا نام بڑی برکتوں والا نکلا۔‘‘

باہر آکر ٹیکسی لی۔ٹیکسی میں وقت اور کسی حد تک پیسے کی بچت کا ہمیں اندازہ ہوا تھا۔راستہ بہت خوبصورت تھا۔دائیں بائیں باغات،سبزہ سکون اور خاموشی سے سجا۔

سچی بات ہے میرے ساتھ تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ کسی بھی بڑی ادبی شخصیت کے میوزیم جاتے ہوئے میرے جذبات بے حد رقیق ہوجاتے ہیں۔دل میں اس کے لیئے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر کا جوار بھاٹا شروع ہوجاتا ہے۔اُس کی محرومیوں اور معاشرے کے ناروا سلوک پر آنکھیں بار بار بھیگنے لگتی ہیں۔بس تو انہی کیفیات کی زد میں اس وقت بھی تھی۔

یوں یقیناً آج کا دن بہت مبارک اور ہمارے لیئے برکت والا ثابت ہوا تھا۔ہماری خوش قسمتی کہ ڈرائیور انگریزی بولنے اور تاریخ جاننے والا نکلا۔وگرنہ تو باڈی لینگوئج اور بروشروں پر دیئے گئے ناموں پر انگلیاں رکھنے اور بھیجا چاٹنے اور چٹوانے سے ہی تھوڑی سی بات بنتی تھی۔۔اس 38 سالہ خوبصورت اور دلبر سے شاعر کا دردناک انجام آنکھوں میں نمی اُتار رہا تھا کہ آپ وہاں جارہے ہیں جہاں اِس نے اپنی زندگی کی بہت سی بہاریں اور خزائیں دیکھیں۔تو اگر آنکھیں گیلی تھیں اور ہونٹوں پر اس کی وہ چند خوبصورت تاثر انگیز نظمیں تھیں تو ایسا ہونا ضروری تھا۔اس کی یہ نظمیں میڈرڈ کے ایک بک سٹال سے

خریدے گئے ایک مجموعہ انتخاب میں سے مجھے بے طرح بھائی تھیں۔

اس کا بے حد متاثر کن مختصر گیت ''خدا حافظ''

اگر میں مر جاؤں
بالکونی کو کُھلی رہنے دینا
وہ چھوٹا لڑکا جو سنگترے کھا رہا ہے
بالکونی سے میں اُسے دیکھتا ہوں
کسان گندم کی کٹائی کر رہا ہے
بالکونی سے میں اُسے سن سکتا ہوں
اگر میں مر جاؤں
بالکونی کو کھلی رہنے دینا

اس نظم میں لورکا نے زندگی کے تمام ادوار کو شامل کیا۔ ''اگر میں مر جاؤں۔'' جیسے مصرع سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ زندگی کی محبوبیت اپنی تمام تر تلخیوں اور اعصاب شکن واقعات کے باوجود کیسے قائم رہتی ہے۔ موت کی ابدی حقیقت اُسے دنیا سے چلے جانے کا پیغام دیتی ہے۔ وہ سمجھتا بھی ہے پھر بھی ایسی خواہشوں کا اظہار کتنا فطری ہے۔

لورکا نے اسے وسیع تر معنوں میں لیتے ہوئے کہا ہے کہ 'بالکونی کو کھلا رہنے دو' بالکونی سے دراصل ایک مراد اس کا ایک مطلب دنیا ہے ۔ زندگی کو بہتر انداز میں گزارنے کی خواہش اور نئے چیلنجز کا سامنا کرنے کا عزم اس کی زندگی کا سارا فلسفہ بس اسی میں مضمر ہے۔ جس کا اظہار جا بجا ہوا ہے۔ اگرچہ موت اہم مضمون کے طور پر اس کی شاعری میں نمایاں ہوئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بہت رجائیت پسند تھا۔ جیسے اس کی اپنی موت ۔ فاشٹ طاقتوں نے صرف انسان کو مارا۔ نظریہ زندہ رہا۔ یہ لافانی ہے کیونکہ آزادی

کی تو ہمیشہ ضرورت رہی ہے اور رہے گی اسی طرح جیسے محبت۔ اسی لیئے اس کی زندگی کا فلسفہء محبت صرف اور صرف آزادی کی بنیاد پر ہے۔

میں تمہارے پاس سے گزرا
محبت میں بغیر اسے جانے
مجھے تو اب یہ بھی نہیں پتہ
تمہاری آنکھیں کیسی لگتی ہیں
نہ ہی تمہارے ہاتھ
اور نہ ہی تمہارے بال
میں تو صرف تتلی کو جانتا ہوں
اور اپنے ماتھے پر تمہارے بوسے کو

بعض ذرائع کے مطابق فائرنگ سکواڈ میں کھڑے موت سے ذرا پہلے اُس عظیم شاعر اور آزادی کے لیئے لڑنے والے جیالے نے شوٹ کرنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور اپنے اشعار گنگنائے۔

وہ آدمی کیا ہے جسے آزادی نصیب نہیں
او میری آنا (Mariana)
میں تم سے پیار کر ہی نہیں سکتا
اگر میں آزاد نہیں
میں تمہیں اپنا دل کیسے دے سکتا ہوں
جب کہ یہ میرا ہے ہی نہیں

نازی طاقتوں نے لوگوں کو غلام بنانے پر اپنی ساری توانیاں صرف کردی

تھیں۔لورکا نے کہا۔اُن کے پاس اپنا دل ہی نہیں ہے تو وہ کسی کو کیسے دیں۔عظیم شاعر کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔اُسے غربت بُری نہیں لگتی تھی۔ہاں اپنے آپ کو کھو دینا اُسے سخت ناپسند تھا۔وہ کہتا تھا اپنی روح کو اپنے پاس رکھو کیونکہ یہی سب سے قیمتی متاع ہے۔حتیٰ کہ زندگی سے بھی زیادہ۔انفرادی آزادی ہی اُس کا عشق تھا۔اس کی آرزو تھی۔اُس کی دو اور مختصر سی نظموں نے جیسے میرا دل مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔

یہ سچ ہے
ہاں اِس درد کی قیمت
جانتے ہو
تم سے محبت کرنا اس طرح
جیسے میں کرتا ہوں

مجھ سے یہ کون خریدے گا
یہ ربن جو میں پکڑے ہوئے ہوں
سفید کاٹن کی یہ اُداسی
جو وہ رومال بنانے کے لئیے کرتی ہے

تمہارے پیار کے لئیے
ہوا مجھے تکلیف پہنچاتی ہے
میرا دل اور میرا ہیٹ
دونوں مجھے تکلیف دیتے ہیں

اپنی یادوں کے بوجھ مت اٹھاؤ
انہیں میری چھاتی میں چھوڑ دو
سفید چیری کے پیڑوں پر طاری کپکپی اور لرزہ
اس جنوری کے ظالم مہینے میں
اذیت ناک خوابوں کی ایک لام ڈور
یہ مجھے مُردوں سے علیحدہ کرتی ہے
تازہ للّی کا درد میں محسوس کرتا ہوں
جو ایک منجمند چاک زدہ دل کے لیئے ہے
باغ میں پوری رات
میری آنکھیں دو کتوں کی طرح جاگتی رہیں
ساری رات ناشپاتی کے پھل
زہر بہتا رہا
بعض اوقات ہوا میں
بندوق کی گولی جیسا خوف سرسراتا تھا
اور پژمردہ سا گل لالہ
سردی کی صبح کا آغاز کرتا ہے

یہ اس کی چند مشہور، پسند کی جانے مختصر نظموں میں سے ایک ہے۔ شاعر بخوبی جانتا تھا کہ قرطبہ گیارہویں صدی میں سپین کے عربوں کا علم دوست اور متمدن شہر تھا۔

سوار کا گیت

قرطبہ دور ہے

اور تنہا بھی ہے

سیاہ خچر اور جوبن پر پہنچا ہوا چاند

میری کاٹھی میں زیتون

گو سڑکوں اور راستوں سے میں آشنا ہوں

لیکن میں قرطبہ کبھی نہیں پہنچوں گا

خوشگوار خنک ہواؤں سے ٹکراتے

وادیوں سے گزرتے

موت میرے انتظار میں ہے

قرطبہ کے میناروں کے پیچھے سے

افسوس سڑک کتنی لمبی ہے

افسوس میری بہادر خچر

افسوس موت انتظار میں ہے

اس سے پہلے کہ میں قرطبہ پہنچوں

ٹیکسی سے اُترے تو ہواؤں کی خنکی، دھوپ کی نکھی سی تپش، درختوں کی ہریالی ان کا بانکپن اور ماحول سے پھوٹتی خوشبو نے استقبال کیا تھا۔

خوبصورت اور مختلف النوع درختوں کا ایک پھیلاؤ راستے کے دونوں اطراف میں نظر آتا تھا۔ یہ پارک اس کی یاد میں بنایا گیا ہے اور اسے اس کا ہی نام دیا گیا ہے اور اسی میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سات یا آٹھ منٹ کا راستہ۔ جہاں گلاب کے قطعے چنبیلی کے بوٹے

اور رنگا رنگ پھولوں کے قطعے نظروں کو گرفت میں لیتے ہوئے جیسے کہتے ہیں دامن دل می کشد کہ فردوس ایں جا است۔

سفیدی میں نہاتا ہوا سبز دروازوں والا، خوبصورت ریلنگ والے بڑھاوں کے ساتھ دومنزلہ مستطیل گھر جو سنگترے کے بوٹوں سے آگے نظر آتا تھا۔ یہاں فوارّے گنگناتے تھے اور دھوپ چمکتی تھی۔ گھر کی ایک سمت دو لمبے سائپرس کے پیڑ ہیں جو لورکا اور اس کے بھائی نے اگائے تھے جب وہ بچے تھے۔

عمارت کے اندر گل وگلزار اور پھل پھول کا جو جہاں نظر آتا ہے۔ وہ انسان کو سحر زدہ کرتا ہے۔ اس کے چلتے قدموں کو بار بار روکتا ہے۔ اس کی نظروں کو بھٹکاتا ہے۔ کیفے، ریسٹورنٹوں کے سامنے بچھی کرسیوں پر جہاں لوگ باک بیٹھے کافی کی چسکیاں بھرتے ہیں۔ وہیں کھجور کے بلندوبالا درخت آپ کو بہت کچھ یاد دلاتے ہیں۔ شاعر کے مجسمے کہیں قد آدم صورت میں اور کہیں بلندوبالا پیڈسٹلوں پر گردن تک کی شکل میں دھرے ہیں۔ جگہ جگہ دیواروں پر ٹنگی پلیک پلیٹیں شاعر کے بارے کچھ نہ کچھ بتاتی ہیں۔ باغوں میں کیسے سنگتروں، مالٹوں کے پھل سبز پتوں میں سے جھانکتے فطرت کے حسن کا کس دلکش انداز میں ذکر کرتے ہیں۔

حقیقتاً وہاں اتنا بہت کچھ نظر آرہا تھا کہ بے اختیار ہی انتظامیہ کو داد دینی پڑتی تھی۔ زندہ قومیں کیسے خراج پیش کرتی ہیں اپنی نامور ہستیوں کو۔ سچی بات ہے اگر دیکھا جائے تو شہر کا ایک حصّہ وقف کیا پڑا تھا شاعر کے نام پر۔ اس ایک پر ہی موقوف نہیں Fuente Vaqueros جو غرناطہ سے سترہ میل دور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں کے ایک گھر جہاں وہ پیدا ہوا جہاں اس نے آنکھ کھولی۔ اس نے چلنا سیکھا اور سکول جانے لگا اور وہ دس سال تک اس میں رہا۔ وہ بھی میوزیم اور میڈرڈ میں وہ ہاؤس جہاں اُس کے

شب وروز گزرے اُسے بھی وقف کر دیا گیا ہے۔

وہ 19 اکتوبر کی دوپہر ہمیں اس وقت میں کھینچ کر لے گئی تھی جب لورکا یہاں چمکدار روشن اور گرمیوں کے طویل دنوں میں ٹھہرا کرتا تھا۔

حقیقی معنوں میں یہ ایک کنٹری ہوم تھا۔ایک مکمل مڈل کلاس فیملی کا گھر جہاں گرمیوں کے طویل دنوں میں یہ فوارے اپنا راگ الاپتے رہتے۔دور سُرخ الحمرا کے محلات کی جھلک نظر آتی۔کبھی یہ جگہ غرناطہ کا مضافات تھی۔یہاں باغات تھے مگر آج یہ حصّہ غرناطہ کی حدود میں آ کر اس کا ایک اہم حصّہ بن گیا ہے۔مکانات کو میوزیم کی صورت دے دی گئی ہے اور یہ سب پارک کے اندر ہی ہے۔

یہی وہ گھر تھا جس کے اردگرد کا ماحول اُسے بے حد پسند تھا۔جو اُسے ہمیشہ ہانٹ کرتا تھا۔اُسے لکھنے پر اُکساتا تھا۔اس کا بہت مشہور اور پاپولر کام حتیٰ کہ Blood Wedding اُس نے یہیں لکھی۔

الحمرا جیسے رش اور لوگوں کے جمِ غفیر کا تو بہرحال یہاں پاپا سنگ والا معاملہ بھی نہ تھا۔اس خوبصورت ماحول پر چھائے الوہی سکون اور سناٹے کو چیرنے والی آوازیں بھی کم کم تھیں۔چند چہرے بھی نظر آئے۔نوٹس بورڈ پر کچھ درج تھا۔کیا؟ اس لکھے ہوئے کو کون پڑھے؟ کم از کم ہم تو بڑے ہی نالائق تھے۔

ویسے دن بڑا بھاگوان تھا۔جب وہاں پہنچے اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ایک مہربان سی صورت نے ٹکٹ گھر کا راستہ دکھایا۔شکر ہے ٹکٹ کے لئیے دشواری نہیں ہوئی۔تاہم آسانی بھی نہیں تھی۔جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے گروپ میں پندرہ افراد شامل ہوتے تھے۔ہاں البتہ معمر ہونے کا فائدہ ہوا۔فی کس ٹکٹ تین یورو کا تھا۔ہم تو ایک یورفی کس میں ہی نپٹ گئے۔وقت پونے تین کا ملا تھا۔اب ضروری تھا کہ ادھر ادھر گھوما پھرا جائے۔کچھ

بروشرز مل گئے تھے۔ چمکتی میٹھی سی دھوپ میں بیٹھ کر انہیں پڑھنا مزے کا کام تھا۔

اک ذرا صفحات سے نگاہیں اٹھا کر میں نے اپنے گردوپیش کو دیکھا ہے۔ فطرت کے حسن و رعنائی کا ایک جہان میرے سامنے ہے۔ میں کہیں عالم تصور میں وقت کی اُس ٹنل میں چلی گئی ہوں جہاں وہ دلبر سالورکا اسی جگہ اور انہی روشوں پر گھومتا پھرتا ہوگا۔ بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلتا ہوگا۔

اگست کے دنوں میں اپنے اُسی گھر میں بیٹھے ہوئے کہیں چودہ سال قبل کے اُس وقت کے اپنے احساسات وجذبات کو وہ کیسے شعروں میں ڈبوتا ہے۔ اور وہ نظم میرے لبوں پر آ گئی تھی۔

اپنے کمرے میں فوارے کی آواز سُنتا ہوں
اگست کی ہوائیں
بادلوں کو لے اڑی ہیں
میں خواب دیکھتا ہوں

شاعر، آرٹسٹ اور ڈرامہ نویس اپنے فن کے ہر شعبے میں ہر روز کے تجربات اور عام زندگی کی حقیقتوں کی آمیزش سے اپنا مواد گوندھتا تھا۔ آج کوئی بھی اس گھر کے فوارے کی آواز اس انداز اور اُس احساس سے نہیں سُنتا جیسے وہ سُنتا اور محسوس کرتا تھا۔

وقت دیکھا ابھی ڈیڑھ بجا تھا۔ اب تھوڑا سا وقت اِدھر اُدھر مزید گھومنے پھرنے، ماحول کے حسن سے محظوظ ہونے، کافی شاپ سے کافی پینے اور بُک شاپ پر جا کر کتابوں کا جائزہ لینے کا سوچا۔

کتب خانہ زیادہ بڑا نہ تھا مگر انتہائی خوبصورتی سے سجا۔ لورکا کا سارا تخلیقی کام اس کی سب کتابوں کی صورت میں یہاں موجود تھا۔ یاداشتوں کی صورت میں بائیوگرافی کی

شکل میں۔لطف کی بات تھی کہ اُن میں بہت سی لورکا کی اپنی ڈرائینگ اور پینٹنگ بھی تھیں۔شاعر مصور بھی تو تھا۔

چلئیے یہ بھی مقام شکر تھا کہ بائیوگرافی کا انگریزی ترجمہ چھوٹی سی کتابی صورت میں میں بھی موجود تھا۔اسی کو کھولا اور دیکھنا شروع کیا۔

پیدائش 5 جون 1898 میں Fuente Vagueros میں ہوئی تھی۔ پلوٹھی کا بیٹا، چار بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور دل ربائی والا۔ باپ فریڈرک گارشیا روڈری گیزوس Rodriguez غرناطہ کے نواح میں زرخیز وادی ویگا کا ایک خوشحال جاگیر دار تھا۔ شہر کے وسط میں شاندار ذاتی ولا بھی تھا۔ماں Vicenta لورکا رومیو اُستاد تھی۔قسمت کی دیوی روڈری گروس پر گنے کی صنعت میں عروج کی صورت مہربان ہوئی۔ پیسے کی فراوانی ہوئی تو ولڈرروبئیو (Valderrubio) جو اس وقت اسکیوروسہ (Asquerosa) کہلاتا تھا وہاں ایک بہت بڑا گھر خریدا گیا۔

اس وقت گارشیا لورکا کوئی دس گیارہ سال کا تھا جب خاندان غرناطہ کے اس مضافاتی شہر میں منتقل ہوا۔ خاندان کا سمر ہوم جو Huerta de San Vicente تھا۔اُن وقتوں میں تو یہ غرناطہ کا مضافات شمار ہوتا تھا۔آج تقریباً شہر کا وسط ہے۔وہ فطرت سے قربت محسوس کرنے اور اس ماحول میں رہنے کا خواہش مند تھا کہ اپنی بعد کی زندگی میں اس نے اپنے لئیے ہمیشہ ایسے ماحول کو ہی ترجیح دی۔

بچپن سے ہی اُسے موسیقی سے دیوانگی کی حد تک محبت محسوس ہوتی تھی۔ادب سے شغف تو تھا پر موسیقی میں جیسے جان اٹکی ہوئی تھی۔اُسے Fuente والے گھر کے باہر بھیڑ بکریوں کے ریوڑوں کی چال، نباتات سے بھرے میدانوں، ہواؤں اور پرندوں کی چہکاروں میں موسیقی کی عجیب سی غنائیت محسوس ہوتی تھی۔

پڑھتے پڑھتے میں رُک گئی تھی۔ مجھے شہرہ آفاق ناول ''ڈاکٹر ژواگو'' کا خالق بورس پاسترنک یاد آیا تھا۔ اُسے بھی موسیقی سے عشق تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں لورکا پیانو کے چھ سالہ کورس کے لیئے مقامی میوزک سکول میں داخل ہو گیا تھا۔

موسیقی کے حوالے سے وہ اپنی ترجیحات میں ہمیشہ بڑا واضح رہا۔ کبھی بھی میوزک کی لغوی تفصیلات میں نہیں پڑا۔ ہمیشہ اس کے سامنے دل کے تاروں کو چھونے والی موسیقی کے سُر ہی رہے۔

Claude Debussy، فریڈرک چوپن اور بیتھوون کے سکورز نے اس کے اندر وجدانی کیفیات کو جنم دیا۔ کمپوزر Manuel Falla کی دوستی نے اس کے اندر ہسپانوی روایات وعقائد بارے سنجیدگی سے سوچنے کی تحریک دی۔

ہاں اُس نے قلم کب اٹھایا؟ لکھنا کب شروع کیا؟ یہ بھی دلچسپ واقعہ ہے۔ محرک اُس وقت کا مشہور لکھاری سیگورا Segura بنا جو 1916 میں فوت ہوا۔ اس کے دوست، نوجوان آرٹسٹ، مداح غرناطہ کے کیفے المیڈا Alameda میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اس کا ابتدائی کام جیسے Ballade اور Sonata کو موسیقی کے ساتھ پیش کیا۔ یہ لورکا کے لیئے بے حد خوبصورت اور ناقابل فراموش تجربہ تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے اندر کا تخلیق کار ایک انگڑائی لے کر جا گا۔

سیکنڈری سکول لیول 1915 میں ختم کرنے کے بعد لورکا نے غرناطہ یونیورسٹی سے قانون، ادب اور کمپوزیشن پڑھی۔ یہ 1916 اور 17 کا زمانہ تھا جب لورکا نے اپنے یونیورسٹی استاد کے ساتھ سپین کے شمالی علاقوں کی سیاحت کی اور اُستاد کے حوصلہ دینے پر اپنی کتاب Impressions and Land Scapes لکھی جسے اس کے والد نے 1918 میں چھپوایا۔

دفعتاً سیما پیروز نے موبائل پر وقت دیکھا اور شور مچا دیا۔

''ارے ارے ڈھائی بج رہے ہیں۔اٹھو اٹھو۔''

میں نے کتاب کاؤنٹر پر رکھی اور ڈیسک پر بیٹھے لڑکے کو بتایا کہ میوزیم دیکھ کر آتی ہوں اور اِسے خریدتی ہوں۔ایک طرف رکھ لو۔

میوزیم میں کیمروں کی سخت ممانعت ہے۔مجال ہے کہ آپ کے ہاتھ میں یا بیگ میں ایسی کوئی چیز ہو۔موبائل فونوں پر بھی پابندی ہے۔آپ نے جتنی تصویر کشی کرنی ہے۔اس کے گردونواح میں کرلیجیئے۔حکومت اور شہر نے اپنے شاعر کو خراج پیش کر دیا ہے کہ ہوٹلوں کی ایک لام ڈور بھی اس کے نام کے ساتھ موجود ہے۔خوبصورت سڑکیں اور ماحول اس حُسن کو بڑھاتے ہیں۔اور اب آنے والوں پر بھی لازم ہے کہ اس کا خیال رکھیں۔

خاتون گائیڈ بڑی سمارٹ انگریزی میں دال دلیے والی مگر مصیبت تو یہ تھی گروپ میں کوئی چار پانچ لوگ ہی انگریزی والے تھے۔تین ہم اور دو نیوزی لینڈ کے۔

کہہ لیجیئے داخلہ بڑے ہال روم میں ہوا جو نچلی منزل پر تھا۔فرنیچر اور پردے شاعر کے وقتوں کے تھے۔گھر کوئی چالیس سال سے بند تھا کیونکہ لورکا کی موت کے بعد خاندان یہاں سے شفٹ کر گیا تھا۔فرینکو کے لوگوں نے باقاعدہ اس کی موت کا جشن منایا تھا۔اس کی کتابوں کو غرناطہ کے پلازہ ڈی کارمن میں باقاعدہ جلایا گیا تھا۔اسی پر اکتفانہ ہوا پورے ملک میں کتابوں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

اس گھر کو کہیں 1990 میں اس وقت کھولا گیا۔جب ملک میں جمہوریت آئی۔ لورکا کی چھوٹی بہن بھی اس میوزیم کی سیٹنگ میں شامل ہوئی۔اسی پرانے اور اصلی سٹرکچر کو قائم رکھا گیا۔فرنیچر قدامت کا رنگ لئے ہوئے ہونے کے باوجود بھی آرام دہ ضرور تھا فلیمنکو Falmenco پیانو بھی تھا۔اور دیواریں خوبصورت پینٹنگ اور تصویروں سے سجی

ہوئی تھیں۔اس کے خاندان کی تصویریں۔دوستوں کی۔گہرے سنگی بیلی ڈیلی کی۔

میں سلواڈور ڈیلی کی تصویر کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔مجھے مجموعہ انتخاب میں سے ode to salvador Dali یاد آئی تھی۔یہ ایک طویل نظم تھی۔جسے میں نے میڈرڈ کے سکوائر ڈل سول کے فوارے کے چبوترے پر بیٹھ کر پڑھا اور اس کے چند بندوں پر نشان بھی لگائے تھے۔

اوسیلواڈور ڈیلی تمہاری آواز جس میں
زیتون کی سی خوش رنگی کا چھلکاؤ ہے
میں تو وہی بات کروں گا نا
جو تمہاری شخصیت اور مصوری مجھے بتاتی ہے
تمہاری ناتواں جوانی کی میں تعریف نہیں کرتا
جس سے مجھے واسطہ پڑا ہے
بس میں تو تمہارے تیروں کی مسلسل بوچھاڑ
کے لئیے نغمہ سرا ہوں

آدمی پتھریلے راستوں کو روندتا چلا جاتا ہے
انعکاس کے جادو سے شیشوں کو شرم آتی ہے
خوشبو خانوں کو حکومت نے بند کر دیا ہے
مشینیں بھی بند ہوگئی ہیں

درختوں اور پہاڑوں کی کمی
پرانے گھروں کی چھتوں پر چکراتی پھرتی ہے
ہوا اپنے عدسے سے سمندر کی لہروں کو چمکاتی ہے
اور افق کسی پل کی طرح بلند ہوتا ہے

فوجی جنہیں شراب اور اندھیروں کا نہیں پتا
وہ سیسے کے سمندروں میں خوبصورت عورتوں کے سر قلم کرتے ہیں
رات کا انتہائی محتاط سیاہ مجسمہ
چاند کے گول چہرے کو ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے ہے

لورکا کی زندگی پر اس شخصیت کے گہرے اثرات تھے۔ ڈیلی اور لوئس بنوئیل کے ساتھ اُس کی دوستی کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب وہ 1919 میں میڈرڈ آیا اور یہاں اُس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ پڑھائی سے تو بس واجبی سی ہی دلچسپی تھی۔ اس کا زیادہ وقت آرٹسٹوں اور تخلیق کاروں کے ساتھ گزرتا تھا کہ اس کی زندگی کے اہم ترین انسان ڈیلی، بینوئل اور پیسین بیلا تھے کہ جنہوں نے اسی کی ڈرامائی اور مصورانہ تخلیقی زندگی میں اہم کردار ادا کیئے۔

1925 سے 1928 تک اس کی زندگی کے وہ سال جب اس نے ڈیلی میں بے پناہ کشش اور رغبت محسوس کی۔ لورکا کے ساتھ دوستی اور تعلق کے رشتے نے ڈیلی کو بھی متاثر کیا مگر شاعر کا بے حد جنونی التفات اور والہانہ انداز اُسے پسند نہ آئے۔ ڈیلی کی جانب سے سرد مہری کا اظہار ایسا تھا کہ جس نے لورکا کو توڑ دیا۔ ایک طرف اگر جپسی بلیڈز کی کامیابی لورکا کے لیئے مسرور کن تھی تو وہیں ڈیلی کی رکھائی اور بے مہر رویہ دل شکستگی کا باعث تھا۔ یہ

اس کے ڈپریشن میں اضافے اوراس کے ذہنی دباؤ کے بڑھانے کا موجب تھے۔ اُسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دو متضاد رویوں میں بٹ گیا ہے۔

بطور ایک کامیاب شاعر و مصنف جسے لوگوں کے سامنے ایک متوازن اور پروقار شخص کے طور پر سامنے آنا ہے۔ اور دوسرا اس کا اندر جو محبوب کی ستم ظریفی کے باعث ٹوٹ پھوٹ کر اسے شکستہ اور ناکام انسان بنانے پر تل گیا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اُسے احساس ہوا تھا کہ وہ جپسی شاعر کے طور پر محدود ہو گیا ہے۔ جپسی ایک تھیم ضرور ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کتنے اور راستے اور راہیں ہیں میرے پاس۔ ہائیڈرولک لینڈ سکیپ ۔ مجھے ہرگز ٹائپ شاعر نہیں بننا۔ یہ اُس کا خود سے فیصلہ تھا۔

خاندان کو تھوڑی سی بھنک اس کے ان معاملات کی ہو گئی تھی۔ اسی لیئے انہوں نے اُسے امریکہ بھیجنے کا بندوبست کر دیا۔ یہ 1929 اور 30 کا زمانہ تھا۔ اور جب وہ عرشے پر کھڑا سمندر اور فضا کو دیکھتا تھا اس کے لبوں پر جپسی بیلیڈز Gypsy Ballads کی ایک نظم کے اشعار ابھرے تھے۔

سبک ہوائیں اور شاداب ٹہنیاں
جہاز سمندروں میں
گھوڑے پہاڑوں پر
اور سورج نصف النہار پر
وہ اپنی بالکونی میں خواب دیکھتی ہے
کوئی سبز بالوں اور سبز جسم والی
جس کی آنکھوں میں نقرئی سی

سرد چاندنی جھلملاتی ہے

میں معمول سے زیادہ دیر وہاں کھڑی رہی تھی۔لوگ چلے گئے تھے۔جب سیمانے غالباً میری عدم موجودگی کو محسوس کیا تھا۔ اُس کی آواز نے مجھے متوجہ کیا تھا۔

''بس آجاؤاب''

آگے بڑھے۔ایک ہاتھ کھانے کا کمرہ ہے۔کھانے کی میز پر پڑے کپڑے کی لیس کروشیے سے بنی ہے جسے اس کی ماں نے بنایا تھا۔باورچی خانہ خاصا چھوٹا تھا۔یہاں اس زمانے کا سٹو ونظر آتا ہے۔گائیڈ سے پتہ چلا کہ تب نل نہیں ہوتے تھے بلکہ پانی کنوؤں سے نکالا جاتا تھا۔

اوپر کی منزل نچلی منزل سے زیادہ خوبصورت تھی۔ یہاں لورکا کی خواب گاہ تھی۔ کیا منظر تھا۔آپ وقت کی اُس ٹنل میں ہیں جہاں وہ اپنے ڈیسک پر بیٹھا آپ کونظر آتا ہے۔خوبصورت چہرے والا سیاہ گھنے بالوں والا،خوبصورت آنکھوں والا جوفکر وسوچ میں ڈوبی آنکھوں سے کھڑکی کے باہر دیکھتا ہے۔خیالات کی ایک یلغار ہےاُس کے دماغ میں لکھتے لکھتے اُس نے نگاہیں اٹھا کر باہر دیکھا ہے۔باغ میں درختوں نے سبز پیرھن پہن رکھے ہیں اور پھولوں کے بنفشی اور سرخ پیلے رنگ فضا کا حسن بڑھا رہے ہیں۔ ہواؤں میں نغمگی اور نشیلا پن ہے جو اُس کو مسحور کررہا ہے۔پھر شام اُترتی چلی آرہی ہے۔سورج غروب ہورہا ہے۔وہ کھڑا ہوگیا ہے۔دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی کے سامنے آکر رک گیا ہے۔شام کے مٹیالے سے اندھیرے اجالے میں اُسے الحمرا کے محلات نظر آتے ہیں۔

آپ کے کانوں میں گائیڈ کی آواز گونجتی ہے۔کھڑکی کے پاس دھرے اس سٹول کو دیکھ رہے ہیں نا آپ۔اس پر بیٹھ کر وہ بہت دیر تک دور الحمرا کے محلات دیکھتا تھا۔الحمرا اُسے ہمیشہ بہت ہانٹ کرتا تھا۔

اب وہاں دیر تک کھڑے ہونا اور کھڑکی سے باہر دیکھنا تو ضروری تھا نا۔

ڈیسک کے اوپر اس کے موبائل تھیٹر کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ تصویر مجھے ایک اور جہان میں لے گئی ہے۔ تھیٹر کے لئیے شاعر کا شوق و وارفتگی بے پایاں تھی۔

دراصل میڈرڈ جانا اور یونیورسٹی میں داخلہ لینا بھی گارشیا کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل تھا۔ لوئس Bunuel اور Sa Lvados Qali اور دیگر بہت سے تخلیق کاروں سے میل جول اور دوستیاں اس کے ذہنی افق کو کشادگی دینے میں بہت اہم ثابت ہوئیں۔ ریمون Ramon Jimenez جیسے شاعر کی خصوصی شفقت اُسے حاصل ہوئی۔ میڈرڈ کے تھیٹر ڈائریکٹر جارج Martinez Sierra نے بصد اصرار اُس سے ڈرامہ لکھوایا۔ یہ اس کا پہلا ڈرامہ The butterfly's evil spell تھا جسے اس نے خود لکھا اور خود ڈائریکٹ کیا۔ یہ ایک منظوم ڈرامہ تھا۔ ایک عجیب و غریب سی محبت کا غمّاز جس میں ایک کاکروچ اور تتلی مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ معاونت دوسرے کیڑے مکوڑوں نے بھی کی۔

تاہم بعد میں کہیں اپنے کسی انٹرویو میں اس نے یہ بھی کہا کہ 1927 میں لکھا جانے والا میرا ڈرامہ mariana Pineda ہی دراصل میرا پہلا پلے ہے۔

قانون اور فلاسفی میں ڈگری بھی اِسی دوران حاصل کی۔ تاہم اُسے پڑھنے اور امتحان پاس کرنے سے زیادہ لکھنا پسند تھا۔

1921 میں نظموں کا پہلا مجموعہ چھپا۔ اس میں 1918 سے لکھا جانے والا منتخب کام شامل تھا۔ لورکا کے بھائی نے بھی اس سلسلے میں معاونت کی۔ فطرت، تنہائی اور مذہبی اعتقادات کی اِن نظموں میں خوبصورت عکاسی تھی۔

یہ کوئی 1922 کے آغاز کے دن تھے جب وہ کمپوزر مینوئل ڈی فلا Falla سے

غرناطہ میں ملا کہ وہ فلیمنکو Flamenco آرٹ فیسٹول کی پروموشن میں اس کی اعانت کرے۔اس سال اس کی زندگی کے دو اہم کام ہوئے۔اس نے ’’Poem of the deep song‘‘ لکھی اور فلیمنیو آرٹ فیسٹول کی اہمیت بارے آگاہی کا سلسلہ شروع کیا۔یہاں غرناطہ ہی میں اگلے سال جون میں اس نے اُندلس کی ایک کہانی کو ڈرامائی تشکیل دی۔یہ بچوں کے لیئے ایک بے حد دلچسپ اور معلوماتی ڈرامہ تھا جو دنوں کیا ہفتوں چلا۔جس نے بچوں کے ساتھ بڑوں نے بھی دیکھا اور لُطف اٹھایا۔

اگلے چند سالوں میں آہستہ آہستہ وہ سپین کے پروگیسو گروپوں کے ساتھ منسلک ہوتا چلا گیا۔شاعری کے مجموعے چھپتے چلے گئے جن میں Canciones،(Songs) اور Romancero Gitano (gypsy Ballads) بھی شامل تھے۔جپسی بلیڈز بہت غیر معمولی کتاب ثابت ہوئی کہ اس نے سپین کے دیہاتوں اور شہروں میں تہلکہ مچا دیا۔

دوسرے پلے میں اُسے Salvador Dali جیسے ذہین انسان کا تعاون ملا۔اس نے موچی کی عجیب الخلقت بیوی کے عنوان سے ایک ڈرامہ پیش کیا۔ایک مزاحیہ ڈرامہ جو ایک موٹی، بھدی ادائیں دکھاتی بدتمیز بیوی اور اس کے موچی شوہر پر تھی۔

ہم سپین کے لوگوں کو ان کا گم شدہ ورثہ لوٹانے جا رہے ہیں۔

اس کی یہ کاوش تھی کہ لوگوں کے شعور و آگہی میں وسعت پیدا ہو۔سوال کرنے کا حوصلہ جنم لے۔عورتوں میں اپنے حقوق کے حصول اور ظلم کے خلاف ڈٹ جانے کا حوصلہ پیدا ہو۔فحاشی، ہم جنسیت اور طبقاتی مسائل پر لوگوں کی معلومات بڑھیں۔لورکا کا کہنا ہے۔

تھیٹر رونے اور ہنسنے کی جگہ کے ساتھ ساتھ انسانی رویوں، اُن کی خامیوں، کجیوں اور اعلیٰ اقدار سے سیکھنے کی بھی جگہ ہے۔تھیٹر ایک شاعری ہے جو کتاب سے اٹھتی ہے اور انسان بن کر باتیں کرتی اور شور مچاتی ہے۔اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی یہ کاوشیں ثمر بار

ہوئیں۔

اور وہ سپین کا انتہا سے زیادہ پسند اور سراہا جانے والا شاعر، ڈرامہ نویس اور آرٹسٹ ٹھہرا۔

کیا کبھی اس پر غور کیا گیا کہ کس چیز نے اُسے اتنا مقبول کیا۔ اس کی حساس آنکھ اپنے اردگرد بکھرے واقعات اور افراد کو دیکھتی، متاثر ہوتی، محبت کے رنگ ڈھنگ، اس کا حسن اور فلسفہ، موت کی تلخیاں اور جنوبی سپین کا کلچر سب نے اس کی شاعری میں نئے رنگ بھرے۔ اس کا ایک اپنا شاعرانہ مزاج اور نظر تھی۔ اپنا اسلوب اور انداز جس نے شاعری کیا ڈرامہ کو بھی نیا حسن اور نیا رنگ دیا۔

Blood wedding ایک لازوال ڈرامہ ثابت ہوا۔ جس کے کردار دولہا، ماں، دُلہن اور لیونارڈ واُن کرداروں کی ادائیگی اس انداز میں نہیں کرتے جیسے انہیں کرنے چاہیں۔ آغاز میں ہی یہ صورت جنم لے لیتی ہے تاہم جب ڈرامہ آگے بڑھتا ہے اور انہیں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حل یہی نظر آتا ہے کہ وہ سوسائٹی پر دوحرف لعنت کے بھیج دیں اور جیسے جی چاہتا ہے وہ کریں۔ کردار سپین کے اُس معاشرتی ڈھانچے سے لگا نہیں کھاتے تھے جو اس وقت رائج تھا۔ جہاں عورت کے لیئے گھر میں رہنا، گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا اور خاندان سے بنا کے رکھنا ضروری تھا۔

1926 سے 1936 تک کے دس سالوں کا بیشتر حصّہ خصوصاً گرمیاں اس نے غرناطہ کے اِس گھر Huerta میں گزارے۔ یہاں اس کا زیادہ اہم کام ہوا جن میں When Five years Pass اور Blood Wedding میں ترمیم اور اضافہ ہوا۔ Yerma بھی اسی گھر میں لکھی گئی۔

وہ جانتا تھا کہ اس نے جو راستہ چنا ہے وہ کانٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بڑا نازک

وقت تھا جب ملک کی بڑی اہم شخصیت شاہ کا دست راست Jose Calvo قتل ہوا۔ملکی سطح پر سیاسی اور معاشی حالات میں اضطراب اور بے چینی نے جنم لیا۔لورکا کو احساس ہوا تھا کہ وہ بھی اپنی بے باک تحریروں اور تقریروں سے داہیں بازو کے نظریاتی لوگوں کو بہت کھٹک رہا ہے۔غرناطہ کے شب و روز بڑے ہنگامہ خیز ہوگئے تھے۔شہر کا مہینوں سے کوئی میئر نہیں تھا۔لوگ اِس سیٹ کو قبولنے سے قطعی انکاری تھے۔تاہم پھر لورکا کے بہنوئی مینوئل فرنینڈز نے ایسے کڑے وقت میں فیصلہ کیا کہ وہ اِس سیٹ پر کام کرے گا۔مگر بدقسمتی کہ ابھی اسے چارج سنبھالے ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا۔یہ اگست کا وسط تھا۔صُبح بہنوئی قتل اور اگلے دن لورکا گرفتار ہوا۔الزامات کی نوعیت میں اگر اس کا سوشلسٹ اور فری میسن تحریک سے جڑا ہونا تھا تو وہیں اس کی ہم جنس پرستی اور دوسری منفی قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہونا بھی ان کے نزدیک اس کے سنگین جرم تھے۔

کچھ لوگوں کے نزدیک لورکا کے قتل میں ذاتی اور سیاسی محرکات تھے۔کاروباری چپقلش بھی کارفرما تھی۔اس میں اس کے باپ کے خاندان کے کچھ بااثر افراد بھی شامل تھے۔کچھ کے نزدیک یہ محض فوجیوں کی اہم اور متنازعہ شخصیات کو قتل کرنے کی سازش تھی۔

تاہم علم وادب اور ثقافت و کلچر کے میدان کی عہد ساز شخصیت دائیں اور بائیں بازوؤں کے اندھے تعصّبات کی بھینٹ چڑھ گئی۔

اُسے احساس تو تھا کہ وہ ایک متنازعہ شخصیت ہے۔پکڑے اور قتل ہوجانے کا احساس کہیں نہاں خانہ دل میں موجود تو رہتا تھا۔سالوں پہلے کہیں اس نے یہ نظم لکھی تھی۔

ذرا اس کے اشعار پڑھیئے۔

کہیں میرا وجدان کہتا تھا
مجھے قتل کر دیا جائے گا

انہوں نے مجھے تلاش کیا
کیفوں میں، کہیں قبرستانوں میں
اور کہیں چرچوں میں
لیکن میں انہیں نہ ملا
وہ مجھے کبھی نہیں ڈھونڈ سکیں گے
کبھی بھی نہیں

یہ بھی حقیقت ہے کہ لورکا ایک سیاسی شخصیت بھی تھی اور دونوں رپبلیکن اور نیشلسٹ کیمپوں میں اس کے ساتھی تھے۔

Gibson اس قتل بارے 1978 میں اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ لورکا پاپولر فرنٹ کا بڑا متحرک سرپرست تھا۔ یہ 1936 کا سال تھا اور فروری کا مہینہ تھا جب لورکا نے ایک بڑے اجتماع میں جو اس کے دوست رافیل البرٹی کے اعزاز میں ہوا تھا جہاں اس نے اونچی اور جوشیلی آواز میں اس پارٹی کے منشور کو پڑھا تھا۔ بہت ساری اینٹی کیمونسٹ شخصیات کو لورکا سے ہمدردی تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کا قتل ہو۔ شہادتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ روسالب Rosaleb کو بھی بہت قریب سے مارا گیا۔

اور اسی طرح گورنر Valdes کو بھی جس پر لورکا کی مدد کرنے کا الزام تھا۔

میری نگاہیں ایک بار پھر کمرے کے طواف میں محو تھیں۔ میرے سامنے وہ میز اور کرسی تھی۔ آہنی راڈوں والا بیڈ۔ تو کیا یہی وہ کمرہ تھا اور یہی وہ کرسی تھی جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا جب اس کے Fulangist گارڈ نے اُسے آواز دی۔ وہ باہر آیا جہاں جیپ کے پاس اس نے ملٹری ملیشیا کے تین سارجنٹوں کو دیکھا جنہوں نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور غرناطہ کی جیل لے گئے۔

رُوس کے عظیم شاعر پشکن کی طرح جو باہر کی پکار پر گھر سے نکلا تھا تو واپس آنا بھول گیا تھا۔ شاعر بھی کبھی واپس نہیں آیا کہ 19 اگست کو ہی اُسے جیل سیل سے نکال کر غرناطہ کے Vizmar اور Alfacar کے درمیانی جگہ پر عین بڑے چشمے کے پاس جو سڑک کنارے تھا وہیں دو گولیوں سے قصہ تمام کر دیا۔

اوپر کی منزل کے دیگر کمرے دھیرے دھیرے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں اس کے کام اس کے خاندان کی بے شمار تصویریں ہیں۔ باپ ماں بہن بھائیوں کے ساتھ۔ دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ جو اس کی زندگی کی کئی کہانیوں کی تہیں کھولتی ہیں۔ گھر کی تقریبات جو اس خوشحال گھرانے کی داستان بھی سناتی ہیں۔

اِس گھر کو کتنے بڑے لوگوں نے دیکھا ان کے نام یہاں لکھے گئے ہیں۔ ہم چھوٹے لوگ مگر اِن بڑے لوگوں کے عاشق۔ ہم بھی تو اسے دیکھنے آئے۔ چلو یوسف کی اُس بوڑھی خریدار کی طرح جس نے اپنا نام یوسف کے خریداروں کی فہرست میں درج کروایا اور تاریخ میں زندہ ہوئی۔

باہر بہت خوشگوار دھوپ تھی۔ ایک کمرے سے نکل کر دوسرے میں داخل ہونا اور نئی چیزیں دیکھنا بڑا پُرمسرت کام تھا۔ تاہم دل میں ایک عجیب سی افسردگی کا احساس بھی موجزن تھا۔ کیا انسان تھا۔ جسے تعصّبات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ کتنی چھوٹی عمر اور کتنے بڑے کام۔

بکھرے نظاروں نے یاسیت بڑھا دی تھی۔ فضا، درختوں، پھولوں، پودوں کی خاموشی اور سکون نے اِس دکھ کو قدرے زائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

گائیڈ نے اس کی نظم چاند پڑھی۔ یہ ہسپانوی میں تھی۔ ہمارے کہنے پر اس نے اس کا وہ ترجمے والا بروشر ہمیں تھما دیا۔

چاند

لڑکا دیکھتا ہے
اور دیکھتا چلا جاتا ہے چاند کو
ہواؤں میں شوخی اور سرکشی ہے
چاند اپنے بازو پھیلاتا ہے
وہ کیسا خوبصورت اور سیکسی لگ رہا ہے
اس کی جگمگ جگمگ کرتی چھاتیاں
بھاگ جاؤ چاند، ڈور جاؤ
اس سے پہلے کہ جپسی آ جائیں
سفید بالے اور سفید نیکلس پہنے
وہ اپنی دھڑکنوں پر رقص کریں گے
لڑکے کیا تم مجھے ڈانس کرنے دو گے
جب جپسی آئیں
وہ تمہیں لوہار کی سندانی پر دیکھیں گے
تمہاری چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند ہوں گی
بھاگو چاند بھاگو
چاند بھاگو بھاگو
مجھے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں آتی ہیں
لڑکے مجھے چھوڑ دو
گھڑ سوار ڈرم بجاتے آئے ہیں

لڑکا لوہار کی بھٹی پر
اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کیئے بیٹھا ہے
زیتون کے درختوں کے جھنڈوں میں سے
کانسی کی زرہ بکتریں پہنے
کچھ خواب آنکھوں میں لیئے
جپسی آتے ہیں
گھوڑوں پر ان کے سر بلند ہیں
ان کے پپوٹے نیچے لٹکے ہوئے ہیں
بگلے کس خوبصورت انداز میں
درختوں میں بیٹھے گاتے ہیں
چاند تو آسمان پر سفر کرتا چلا جاتا ہے
لڑکے کے ہاتھ کو تھامے ہوئے
لوہار کی بھٹی پر
جپسی چیختے چلاّتے شور مچاتے ہیں
ہوا تو بس چاند کو
دیکھتی اور دیکھتی چلی جاتی ہے

1928 میں چھپنے والا اس کا مجموعہ Ballad of the Moon جس کی نظمیں اُندلیسیہ کے جپسی لوگوں کے شب و روز کہ جن کے متعلق شاعر بہت متاثر اور جذباتی تھا۔ پہلی نظم چاند کے بارے میں کہ جو اِن جپسیوں کی زندگی کا اہم کردار تھا The Romancero Gitano جسے انگریزی میں بالعموم جپسی بیلیڈز کا نام دیا گیا

ہے۔1928 میں پہلی مرتبہ چھپی۔اٹھارہ رومانوی موضوعات کا مثلاً رات،موت،آسمان اور چاند۔یہ رومانی لوگوں اوران کے کلچر کی نمائندہ نظمیں ہیں۔لیکن دراصل اس میں صرف اس تھیم کوہی استعمال میں لایا گیا ہے جسے اپنا کرشاعرلوگوں تک اپنی بات پہنچانا چاہتا تھا۔یہ نظمیں بہت مشہور ہوئیں۔بہت سراہی گئیں۔یہ دراصل اندلیسہ کے جپسیوں،اُن کے گھوڑوں،ان کے خاص قسم کے کبوتر، چاندستارے،روم سے آنے والی صبحوں کی ٹھنڈی میٹھی ہوائیں،دریا،اُن کے مشغلے اور جرائم،اُن کے جنتی دیوتا اورقرطبہ کے مفلوک الحال ننگے بچوں پرمشتمل تھیں۔

میری سماعتوں سے گائیڈ کی آوازٹکرائی ہےجس نے غالباًبروشرز کےصفحات میں میرا انہماک دیکھ کر کہا ہے کہ لورکا کو پڑھنے کا مزہ دراصل ہسپانوی زبان میں ہی ہے۔ترجمہ میں وہ مزہ نہیں ملتا۔حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا حسن اورخوبصورتی سپین کا رومانس اور ہسپانوی زبان کی شیرینی اوراس کا ترنم آپ کومسحور کردیتا ہے۔لورکا بیسویں صدی کا بہت عظیم شاعر۔اس کی شاعری اس کا تخیل اس کا خاص طور پر جنوبی سپین کے استعارےاورتشبیہات کے حصّے اندلیسہ کےکلچراورثقافتی پہلوؤں پرلورکانے جوکچھ ہسپانوی زبان میں داخل کیا اُس نے اس کووہ وسعت دی کہ جس نے اِسے دنیاکےادب میں ممتاز کیا۔بعینہٰ اسی طرح جیسے روس کےقومی شاعرالیگزینڈر پشکن کی ''رُسلان اورلُدمیلا'' تین ہزارمصرعوں پرمشتمل طویل نظم نے روسی شاعری کودنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلے پر لاکھڑا کیا تھا۔

پراسرارجادوئی چانداس کی وہ شاہکارطویل نظم ہےجس میں احساسات وجذبات کی یلغارنظرآتی ہے۔ایک اسرار سے بھری ہوئی۔لورکانے ایک بارکہا تھا۔ہمیں زندہ رکھنے میں مسٹری کابہت بڑا کردار ہےاور یقیناًاس کی لازوال شاعری کاایک بنیادی اوراہم وصف

مسٹری ہے۔

نظم جس کا مرکزی کردار تو جوان جپسی لڑکا ہے۔نظم لڑکے اور چاند کے گرد گھومتی ہے۔اُس کی چاند سے محبت، دیوانگی اور عشق اس کی موت کا باعث بن جاتا ہے۔نظم نہ صرف لڑکے کی موت کو واضح کرتی ہے بلکہ اس کے اثرات پر بھی بات کرتی ہے۔جب کوئی محبت میں دیوانہ ہوتا ہے اور جذبے متحرک ہوتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟

جادوئی سا تاثر لیئے جہاں چاند کی میٹھی ،نرم،ٹھنڈی اور دل میں طوفان اٹھانے والی چاندنی اور لطیف ہواؤں میں رقاصہ کا رقص آپ کو کسی جادوئی دنیا میں لے جاتا ہے۔

جپسی بلیڈGypsy Ballas جیسے مجموعے کے اتنے پاپولر ہونے کی وجہ بس یہی تھی کہ یہ حقیقت اور ملمع کی آمیزش سے گندھا ہوا خوبصورت مجموعہ ہے۔

لورکا انگریزی کا ایک لفظ نہیں پڑھ سکتا تھا۔اس لیئے یہ کہنا کہ وہ انگریزی شعرا بائرن یا کیٹس سے متاثر تھا غلط ہے۔اس کے ابتدائی کام کو اگر مادیت ،نغمگی ،موسیقیت اور اسلوب کے اعتبار سے برطانیہ کے رومانوی دور کے اِن شاعروں کے ہم پلّہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔اس کے مختلف زبانوں میں تراجم سے قاری اگرچہ شاعر کے ذخیرہ الفاظ کی وسعت اور خیالات وگرامر کی جدت واختراع سے متاثر ہوا ہے۔تاہم وہیں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اس کا انداز فنّی طور پر جدید زمانے جیسا بھی نہیں ہے۔وہ زمانہ جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیان کا تھا۔

اس کے ہسپانوی ورثے نے قدامت وجدّت کی آمیزش سے اس کے کلام اور اس کی تحریروں کو وہ انفرادیت دی جو دوسروں کے ہاں نہیں ملتی۔جیسا کہ Hughes نے کہا کہ اب اگر تم سپین سے نفرت کرتے ہو تب بھی تم لورکا سے پیار کروگے۔اس کی ایک اور نظم پڑھیئے۔

زندگی ایک خواب نہیں ہے

احتیاط،احتیاط،احتیاط

کبھی تو ہم زمین کی نم آلود مٹی

کھانے کے لیئے سیڑھیوں سے گرتے ہیں

اور کبھی پہاڑوں کی برفیلی چوٹیوں کے نوکیلے کناروں پر

مرجھائے ہوئے ڈیلی پھولوں کی آوازیں سُنتے ہیں

لیکن

فروگذاشت کی کوئی گنجائش نہیں

اور نہ ہی خوابوں کے لیئے کوئی جگہ ہے

صرف گوشت پوست باقی رہ جاتا ہے

بوسے ہمارے منہ کو

ایک نئے بندھن سے روشناس کراتے ہیں

اور وہ جو درد کی اذیت سہتا ہے

وہ درد اُسے ہمیشہ یاد یادرہتا ہے

اور جو کوئی بھی موت سے ڈرا

موت اس کے حواسوں پر سوار ہو جاتی ہے

اب اور بیڈرومز کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں

امریکہ میں اس کے نیویارک قیام کی تصویریں بھی بڑی خوبصورت تھیں۔مختلف شخصیات کے ساتھ مختلف جگہوں کی جن میں ہوانا اور کیوبا بھی توجہ کھینچتی تھیں۔گائیڈ کچھ روشنی اس پر بھی ڈال رہی تھی۔

امریکہ میں زیادہ وقت نیویارک میں گزرا۔اس نے کولمبیا یونیورسٹی کے جنرل سٹڈیز سکول میں داخلہ تو لے لیا۔لیکن وہ ہمیشہ سے پڑھنے سے زیادہ لکھنے میں دلچسپی لیتا تھا۔ ہوانا اور کیوبا میں بھی اس نے کچھ وقت گزارا۔وال سٹریٹ کرپشن کا واقعہ بھی انہی دنوں ہوا جس کا وہ عینی شاہد تھا۔اس کی نظموں کا مجموعہ ایک شاعر نیویارک میں تیار ہوگیا جو کہ 1942 میں چھپا۔

اس نئی دنیا اور مختلف ملکوں کی سیاحت نے اس پر نئے رنگ وا کیئے ۔اس کی شاعرانہ گرفت میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ بہاؤ اور اس کی روانی میں تیزی آئی ۔ اس کے ابتدائی کام میں جو علاقائی محدودیت کا تاثر تھا وہ ختم ہوا۔نئے افق اس میں سمائے ۔

1930 میں جب واپسی شروع ہوئی ۔ڈی Rivera کی آمریت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔اور دوسری سپنش ریپبلک وجود میں آچکی تھی۔گارشیا کی سٹوڈنٹ تھیٹر کمپنی میں بطور ڈائیریکٹر تقرری ہوئی جس کا بڑا مقصد دیہی علاقوں میں فری گشتی تھیٹر کے ذریعے سپین کے دیہی لوگوں کو بدلتے زمانے کے نئے رجحانات سے آگاہی اور انہیں تعلیم یافتہ بنانا مقصود تھا۔اس کا سٹائل جدّت کا حامل بنا۔وقت کے حساب سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تھوڑا سا اجنبی تھا۔نیا تھا۔یوں بھی وہ رمز اور علامتوں کا استعمال زیادہ کرتا تھا۔وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔اس کا مفہوم اس کے تحریری ٹکڑوں میں موضوع کے اعتبار سے اپنا آپ واضح کرتے ہیں۔وہ تشبیہ واستعارہ کو خصوصی طور پر ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

لورکا ایک ماہر لکھنے والا تھا۔وہ وقت، ماحول، حالات اور بدلتے رجحانات اور نئی ابھرتی تحریکوں سے اپنی تحریر کی آبیاری کرتا۔تاہم اس کے ساتھ ساتھ اس نے روایاتی، ثقافتی ورثہ کو ہمیشہ اولیت دی۔لوگ اور ملک جن کے درمیان وہ رہا ہمیشہ اس کی ترجیح رہے۔

موت بھی اس کی شاعری میں کہیں واضح اور کہیں ڈھکے چھپے انداز میں بہت

نمایاں رہی ہے۔اس کی یہ نظم پڑھیے ذرا۔

Qasida of the dark doves

سرسبز درختوں کی شاخوں میں
میں نے دو فاختاؤں کو دیکھا
ایک سورج تھی
اور دوسری چاند
میری ننھی منی ہمسائیو
میں نے انہیں کہا
بھلا میری قبر کہاں ہے
سورج نے کہا یہ تو میری دم میں ہے
میرے گلے میں چاند نے کہا
اور میں جو دنیا کے جھمیلوں میں
بے طرح اُلجھا ہوا تھا
میں نے دو برفانی عقاب دیکھے
اور ایک برہنہ لڑکی
ایک دوسرے کا پرتو تھا
اور لڑکی کہیں نہیں تھی
چھوٹے عقابوں میں نے کہا
میری قبر کہاں ہے
سورج نے کہا میری دم میں

میرے گلے میں چاند نے کہا
اُن سرسبز درختوں کی شاخوں میں
میں نے دو ننگی فاختاؤں کو دیکھا
ایک پر دوسری کا گمان ہوتا تھا
اور دونوں کہیں نہیں تھیں

اس کی موت پر بات کرتے ہوئے گائیڈ نے کہا کہ 75 - 1939 فرنیکو کے زمانے تک لورکا کے خیالات اور اس کی موت کو عوامی سطح پر زیر بحث نہیں لایا گیا۔ مگر تا کے یہ بادشاہ فلپ ششم تھا جس نے اقوام متحدہ میں تقریر کرتے ہوئے اس عظیم ڈرامہ نگار، شاعر اور موسیقار کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی باقیات کو ڈھونڈنے کی قرارداد پیش کی اور اقوام متحدہ سے اس میں معاونت کے لیئے کہا۔

اکتوبر 2009 کے وسط میں غرناطہ یونیورسٹی کے تاریخ دانوں اور ماہرین آثار قدیمہ کی ایک ٹیم نے اپنے شہر کے اس بیٹے کی لاش کی کوئی نشانی ڈھونڈنے کے لیئے Alfacar کے باہر اُن کے ممکنہ ٹبے کھائیوں کی کھدائیاں شروع کیں کہ کچھ پتہ تو چلے۔ اس جگہ کی کوئی تین دہائیاں قبل ایک ایسے شخص نے نشان دہی کی تھی جس نے لورکا کی قبر کھودنے میں مدد کی تھی۔ خیال تھا کہ لورکا یہاں پہاڑ کی جانب جاتی اس سڑک کے کنارے پر جو Viznar اور الفاکر Alfacar دیہاتوں کو ملاتی تھی۔ کہیں دفن ہوگا۔

تاہم 70000 یورو کے اخراجات ہونے پر بھی کوئی معنی خیز نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

1953 تک اس کے کام پر پابندی لگی رہی۔ تام اسی سال اس کے سارے کام کو اکٹھا کیا گیا۔ اس سال تھیڑوں میں اس کے تین ڈراموں Blood Yerna,wedding اور ہاؤس آف برنارڈا سٹیج ہوئے اور کامیابی کے جھنڈے

گاڑے۔

ساؤتھ افریکن رومن کیتھولک شاعر روئے Roy جس نے سول وار سے پہلے اور بعد میں بھی قوم پرستوں کو بہت پرجوش طریقے سے سپورٹ کیا۔لورکا کا بہت سا کام انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔

فنون لطیفہ کی اہم شاخوں ڈرامہ اور موسیقی میں اُس نے بہت یادگار کام کیا تاہم ادب میں اس کا اہم اور مشہور کام جو ترجمہ ہو کر دنیا بھر میں پھیلا۔

Poet in New York , Gypsy Ballads اور Poems of the deep songs ہیں۔ڈرامے Blood Wedding سمیت کئی ترجمہ ہو چکے ہیں۔

یوں شاعری کے مجموعے لگ بھگ کوئی چودہ کے قریب ہیں۔

- impressions and Landscapes 1918 میں چھپی۔
- Book of Poems 1921
- Poem of deep Songs 1920 اور 1923 کے درمیان لکھی گئی تھی مگر یہ 1983 میں چھپی۔
- Canciones (Songs) 1921 اور 1924 کے درمیان لکھے گئے یہ گیت 1927 میں چھپے تھے۔
- Gypsy Ballads 1928 اس کا سال ہے۔
- Odes 1928 میں لکھی گئی۔
- Poet in New York 1930 میں لکھی گئی۔موت کے بعد 1940 میں چھپی۔

- o Six Galician Poems 1935 میں لکھی گئی۔
- o Sonnets of dark love 1936 میں لکھی گئی۔موت کے بعد 1983 میں چھپی۔
- o Selected Poems 1941 میں لکھی گئی۔
- o Poems Written 34 - 1931 میں لکھی گئیں اور موت کے بعد چھپی۔

☆☆☆

باب نمبر:6 سپین کا کوہ نور الحمرا

- الحمرا کے ٹکٹ ملنا گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت ملنے جیسا تھا۔
- اپنے کلچر اور ثقافت کی مٹھاس اور تاریخ کی ترشی لیے گرینیڈا اپنے معنی انار کا حقیقی ترجمان ہے۔
- واشنگٹن ارونگ کی کہانیوں میں الحمرا کا طلسم، رومان اور تہذیبی خوشبو کی مہک ہے۔

تو آج صبح خوشی سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ ہر چیز سہانی اور دلفریب نظر آ رہی تھی۔ ہمارے پاس الحمرا کے ٹکٹ نہیں گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت تھی۔ ناشتے میں لطف، بات چیت میں شگفتگی اور چہرے بات بات پر ہنسی کی پھوار میں بھیگتے تھے۔

بے شک ہمارا قیام ایک دن اور بڑھ گیا تھا۔ مسٹر سیلوا ڈور اور نکولس دونوں بڑے مہربان ہو گئے تھے۔ ہمارے کمرے کسی اور کے نام سے کل کے لیئے بک تھے مگر جوڑ توڑ انہوں نے کرتے ہوئے ہمیں ڈسٹرب نہیں کیا۔ سچی بات تھی۔ وہی کہنے کو جی چاہتا تھا کہ آلو کرے کولیاں تے رب پاوے سدھیاں (آپ بے شک حماقتیں کریں اگر خدا آپ کے کام سیدھے کرنا چاہے)۔

مہر النساء نے ٹیکسی لینے کا کہا۔

''ارے نہیں بھئی آج تو مزے لوٹنے ہیں۔ہوپ آن ہوپ آف پر چڑھنا ہے۔جگہ جگہ اُترنا،وہاں کچھ وقت گزارنا اور پھر چڑھنا ہے۔ آج موج میلہ کرنا ہے۔خوبصورت اور دلفریب جگہوں کو آنکھوں میں بسانا ہے۔اپنی چاہت کی کہانی سنانی ہے۔''

''یہ کہانیاں سُننے اور سُناتے ،ہمیں بھگاتے ذرا اِسے بھی دیکھ لیں،ذرا اُس کا بھی دیدار کر لیں جیسی خواہشوں اور اس پرعمل کرنے کی کوششوں میں کہیں ہمارا نہ پڑہ کر دینا۔''

سیما میری ایسی حرکتوں سے بہت عاجز رہتی تھی۔

''چلو یار ہم اپنا رانجھا تو راضی کریں گے نا۔جہاں دیکھیں گے۔ٹیکسی بھی پکڑ لیں گے۔''

اب آہنی سنگلوں سے جڑے تین ڈبوں والی ٹرین کہاں سے ملے گی؟ ٹکٹ کدھر سے لینا ہے؟ کچھ معلوم نہ تھا۔ایک دو سے پوچھا جواب ملا۔

''چلتی جایئے نیو اسکوائر تک۔''

پس گلی جہاں ختم اور بڑی شاہراہ شروع ہوتی تھی وہیں کونے میں سٹال لگائے خاتون ٹکٹ کاٹتی تھی۔

''آٹھ یورو اس نے کہا۔''

اور جب ہم سکے نکالتے اور انہیں گنتے تھے اس نے ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ لوگ ساٹھ سے اوپر کی ہیں۔''

میں ہنسی۔''ہم تو ستر سے بھی اوپر کی ہیں۔''

''تو چار یورو دیجیئے۔''

''لو بھئی چار یورو کی بچت۔ ہے نا خوشی کی بات۔''ایک دوسرے سے چہکتے ہوئے کہا گیا۔

اب بتائے گئے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوگئے۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہ ہوئے ہونگے کہ یہ مہارانی ہماری شاہی سواری گھنٹیاں بجاتی مست خرامی سے ہمارے پاس آکھڑی ہوئی۔تھوڑا ساچڑھنے میں دشواری تھی۔ چھوٹے سے آہنی دروازے پر بازوؤں کا دباؤ ڈالتے ہوئے چڑھ گئے۔سیما کو بھی کھینچ کھانچ کر چڑھالیا۔مہرالنساء تو خیر ہے ہی دھان پان سی۔ایسے پُل صراطوں اور گھاٹیوں کھائیوں سے دامن سنبھال کرگزر جاتی ہے۔ بس اگراس کی سوئی کہیں اٹک کرساکت ہوتی ہےتو وہ وہ برقی زینے ہیں جن کےقدموں یا سر پر کھڑے ہوتے ہی اس کے چہرپر موت کےسائے سےمنڈلانے لگتے ہیں۔

ہم نے بیٹھتے ہی ندیدوں کی طرح دائیں بائیں دیکھنااور آنکھوں کوان خوبصورت منظروں کوجذب کرنے کاحکم سُنایا۔

''واہ بھئی واہ مزے آگئے۔'' ٹھنڈی ٹھار ہواؤں کا ریلا چہرے سےٹکرایا۔

پلازہ نیوا کی تعمیر بھی دراصل غرناطہ کے سقوط کے بعد ہوئی تھی۔ اِس کا موجودہ پھیلاؤ کوئی انیسیوں صدی میں ہوا۔ دریائے دارو Darro کے پُل نے توجہ کھینچی۔ بہت سے پرانے پل بھی دیکھنے کو ملے۔تنگ گلیوں،سڑکوں، بلندوبالا جگہوں سے گزرتی بازاروں سے ہوتی اور کہیں خاموش سناٹے میں ڈوبے دائیں بائیں بلندوبالا درختوں کے سایوں میں اونچی نیچی پہاڑیوں سے گزرتے جب ہماری یہ ٹُم ٹُم کرتی ٹرین ہمارے اُس معشوق دل ربا کے سامنے رُکی۔

تو گویا ہم اب ایک ایسی دنیا میں داخل ہونے جارہے تھے جو ہسپانوی تاریخ کا دل ہے۔ جومسلمانوں کی عظمت رفتہ کی کہانی ہے۔جس کے درودیوار میں محلاتی سازشوں کی

کہانیاں دفن ہیں۔اور جسے دیکھنے کے لئیے ہم کیا پوری دنیا پاگل ہوئی پڑی ہے۔

عین دو بجے ہم اس ہجوم کا حصّہ تھے جو جانے کن کن دنیاؤں سے مارو مار کرتے اِسے دیکھنے آئے تھے۔اسی سیل رواں میں شامل آگے بڑھے۔ پہلے گیٹ پر سیکنر مشین سے ٹکٹ چیک ہوئے ۔کشادہ سڑک پر دورویہ بلندوبالا چنار اور شاہ بلوط جھومتے تھے۔آسمان نیلا اور سورج چمکتا تھا۔فرش پتھریلا سا تھا۔

اب کہنے کو تو اِس ارضی جنت سے وہ نکالے گئے جنہوں نے صدیوں یہاں راج کیا۔ اِسے بنایا ،سنوارا، سجایا۔ چار چاند لگائے۔ یہ چار چاند گو آج گہنا ضرور گئے ہیں پر ڈیڑھ صدی قبل کے حکمرانوں اور لوگوں نے جان لیا کہ موروں کی اِن یادگاروں کی حفاظت ضروری ہے کہ کمائی کا بہترین ذریعہ ہیں۔

موڑ آیا تو رک کر راہنمائی چاہی ۔داہنی جانب مڑنے کا سگنل ملا ۔راستہ خوبصورت اور جذبات کا بہاؤ اپنے عین عروج پر۔ قلعے کی دیوار اور برج ساتھ ساتھ چلتے تھے۔آگے بڑھے تو دورویہ سرو کے بوٹوں کی نہیں ان کے درختوں کی قطاریں یا کہہ لیجئیے دیواریں تھیں۔تراش خراش اور انہیں وضع قطع دینے میں ایسا جمالیاتی حسن تھا کہ بے اختیار رکنا پڑا۔بغور دیکھنا پڑا۔

درمیان میں موگھے بنے تھے۔داہنے ہاتھ کے موگھوں سے دوسری سمت جھانکتی تھی۔ ہرے کچور پیڑوں میں بسنتی رنگے مالٹے اُکساتے تھے کہ ہے ہمت تو آؤ مجھے دبوچ لو۔کرلو میرا شکار۔

سچی بات ہے شکار تو میں کر لیتی کہ ایسے کاموں میں بڑی تگڑی ہوں مگر بندی خانے جانے کا خوف مانع تھا۔

آگے پھر ایک گیٹ اور دربان سے ٹکراؤ۔ٹکٹ کی چیکنگ بڑے محتاط انداز میں

ہوئی۔ یہاں ایک میدان سا تھا جہاں سے تین سمتوں کی طرف راستے نکلتے تھے۔

الحمرا میں تین چیزیں دیکھنے والی ہیں۔ محلات، قلعہ اور باغات۔ ہمارے پاس چونکہ ٹکٹ صرف محلات کا تھا۔ مجاز اسی کو دیکھنے کے تھے۔ گو کہیں منصوبے میں اِدھر اُدھر کی تانکا جھانکی کے عزائم بھی سوفی صد تھے۔ داتے لانا ای لانا۔ یعنی ہیرا پھیری تو کرنی ہی کرنی ہے۔ پر یہ سپین والے بھی بڑے کائیاں اور ماتھے پر آنکھیں رکھنے والے۔ ایسے پکے پکے انتظامات کہ فریبی تو پر نہ پھٹک سکیں۔ چلو جی دیکھتے ہیں۔

باہنے ہاتھ مڑنے کا اشارہ ملا۔ اِس راستے پر دو عمارتوں نے متوجہ کیا۔ دونوں بڑی شاندار تھیں۔ ایک مستطیل نما جو بڑے بڑے بلاکوں سے بنی ہوئی تھی۔ شہنشاہ چارلوس پنجم کا محل جس کی تعمیر میں الحمرا کے کچھ حصّے گرا کر شامل کیئے گئے تھے۔ اِسے دیکھنے کے ہم مجاز نہ تھے کہ ہمارے اس کا ٹکٹ نہیں تھا۔

بے شک ٹکٹ نہیں تھا مگر تصویریں بنوانے پر تو کوئی پابندی نہیں تھی۔ آفتاب بہادر بھی اپنی پوری میزبانی نبھا رہے تھے۔ چہرہ جو خیر سے پہلے ہی جُھلسا ہوا ہے مزید جُھلسنے کی زد میں آ گیا۔ میں نے حفاظتی بند باندھنے کی اپنی سی کوشش تو کی پر تصویریں بھی تو اُتروانی تھیں۔

کارلوس پنجم کے محل کے مرکزی دروازے کے سامنے بیٹھ کر پوز بنائے اور یہ امر یقینی بنایا کہ ثبوت پکا ہو۔

وہیں آسٹریا کے ایک جوڑے سے ملاقات ہوئی جنہوں نے اس کی تفصیلی سیر کی تھی۔ انہوں نے بخوشی ہماری درخواست کو پذیرائی دی۔ ہنس مکھ سے جوڑے نے ہمیں محل کے اندر کی ساری ویڈیو فلم بھی دکھا دی۔ جاتے جاتے محل سے متعلق کچھ باتیں بھی بتاتے گئے کہ کارلوس فرڈینیڈ کا پوتا تھا جس نے الحمرا محل کے کچھ حصّے مسمار کر کے یہ محل بنایا تھا۔

تصویروں نے ذرا متاثر نہیں کیا تھا لگتا تھا کہ جیسے کوئی رومن اکھاڑہ ہو۔ اِس کی بدنمائی کا مزید احساس ہمیں جناب منظور الٰہی شیخ اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتابیں پڑھنے سے بھی ہوا۔ واشنگٹن ارونگ نے تو اس پر ٹھپہ لگا دیا کہ چونکہ عربوں کے لیے اس کے دل میں بڑا تعصب اور کھوٹ تھا۔ ظاہر ہے جب نیت خالص نہ ہو۔ کھوٹی ہو تو کام میں حُسن نہیں آتا۔ یہی اِس محل کے ساتھ ہوا۔ ایڑی چوٹی کا زور تو لگا۔ جو کام نہیں کرنا چاہیے تھا وہ بھی کیا۔ مگر وہ مولوی ملان کی سی بات کہاں۔

تاہم یہ بات بڑی مصدقہ تھی کہ الحمرا اور غرناطہ پر قابض ہو جانے کے بعد بھی عیسائی بادشاہ ایک عرصے تک خوف کی سی کیفیت میں رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا جیسے مور کہیں چھپے بیٹھے ہیں رات کو سو گئے تو بس دندناتے ہوئے ایک دن اچانک ہلّہ بول دیں گے۔ ایک مدت تک وہ یہاں سوئے نہیں۔ اگر واشنگٹن ارونگ کی The Tales of Alhamra پڑھیں تو ان کے یہ توہمات زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں۔

دھوپ اپنے جوبن پر۔ ہواؤں کی پُھرتیاں بھی اس کی تیزی کا بیج مارنے میں ناکام۔ خستہ حال سے درودیوار کا مختصر سا سلسلہ سامنے کی جانب ایک کشادہ میدان کے پس منظر میں ایستادہ تھا۔ گواچی گاں کی طرح اُدھر جا گُھسے۔ کولڈ ڈرنکز کی شاپ سے پتہ چلا کہ محلات کا سلسلہ ہمارے عقب میں ہے۔ اُدھر کیا ہے؟ دس لوگوں سے پوچھا۔ کوئی کچھ بتانے تو کیا رُکنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ حشر کا سا سماں دِکھتا تھا۔ بہر حال پتہ چلا کہ چھوٹے سے سیکورٹی گیٹ کے باہر کھڑے لوگوں کا تانتا دراصل پرانا قلعہ دیکھنے کے لیے جمع ہے۔

دفع کرتے ہوئے محلات کی جانب چلے آئے۔ دو بجے کا وقت تھا۔ لمبی لائن لگ چکی تھی۔

ہائے لائن میں لگنا کتنا مشکل تھا۔ تھوڑی دیر میں ہی دائیں بائیں پہلو بدلنے

لگے۔ آ ہنی زنجیر کے پار فصیل کی چوڑی دیوار تھی جس پر بیٹھا جا سکتا تھا۔ بیریئر سٹینڈ ز کے سامنے کھڑے سیکورٹی گارڈز کی تھوڑی سی منت کرنے پر لائن توڑ کر وہاں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

کیا منظر تھا۔ نیچے ڈھلوانی پہاڑیوں پر سفید گھر چمکتی دھوپ میں جگمگاتے نظر آئے تھے۔ جس دیوار پر بیٹھے تھے اس کی گہرائی خوف زدہ کرتی تھی۔ منظر کی جھلکیوں میں تھوڑی سی شناسائی کا پہلو لاہور قلعے کی شیش محل کے جھروکوں سے نیچے نظر آنے والے نظارے جیسا تھا۔ گہرائی اور کائی زدہ خستگی کم وبیش ایک جیسی ہی تھی۔

ایک اُدھیڑ عمر کا مرد بیریئر سٹینڈ ایک طرف کھسکاتے ہوئے ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پتہ چلا کہ پاکستانی نژاد برطانوی شہری ہے۔ بڑا جلا بھنا ہوا تھا۔ انور محمود گذشتہ سال الحمرا دیکھنے آیا تھا۔ ٹکٹ بھی پاس تھا۔ دن جمعے کا تھا۔ جمعہ پڑھنے مرکزی مسجد چلا گیا۔ جہاں سے آتے ہوئے بس پندرہ منٹ لیٹ ہو گیا۔ نگرانوں نے گُھسنے نہیں دیا۔ لاکھ اس نے سر پٹخا کہ نماز کی ادائیگی میرے لیئے مقدم تھی۔

نہیں جی جیسے کانوں میں تو نبے ٹھونس لیے تھے۔ بے چارہ شریف آدمی۔ کوسنوں اور گالیوں پر ہی اکتفا کیا ہوگا۔ بس نامراد لوٹ گیا۔ اِس سال پھر آیا۔

اِس المناک داستان نے ہمیں ایک بار پھر خدا کے حضور شکریہ ادا کرنے کی ترغیب دی۔ احسان ہی تھا نا اس کا کہ یہاں بیٹھے تھے۔

بہت سے گورے گوریوں نے اب جہاں کھڑے تھے وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ دھوپ کی تیزی نے سوئیٹر جیکٹیں بھی اُتر وانا شروع کر دی تھیں۔ نظارے بڑے موہ لینے والے تھے۔ دفعتاً ایک نوعمر جوڑا ہنستا کھیلتا چہلیں کرتا آیا۔ لڑکی کے لیئے گل نہیں شعلہ کہنا زیادہ موزوں تھا۔ بھڑکتا ہوا پارے کی طرح مچلتی اور تھرکتی۔ لڑکا البتہ قدرے

دھیما اور سنجیدہ سا تھا۔ خوبصورت بلاشبہ زیادہ تھا۔

دفعتاً لڑکی نے السلام علیکم کہہ کر حیران کر دیا۔ یہ جوڑا بھی لندن سے آیا تھا۔ پاکستانی والدین کا جن کی مائیں ابھی بھی وہاں شلواریں پہنتی ہیں۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ہنی مون پر نکلے ہوئے تھے۔ قرطبہ کو دیکھ آئی تھی۔ اس کے گُن گاتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر ماحول کو دیکھا۔ عجیب سا دل کو زیر وزبر کرتا حُسن مسحور کرتا تھا۔ میں تاریخ کے پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اِسے یاد کر کے اپنے اِن پر مسرت سے لمحات کو سوگواری کی بھینٹ چڑھانے سے گریزاں تھی۔ اتنی تو دکھ بھری اور سسکیاں لینے والی ہے یہ۔ دفع دور، لعنتی نا ہو تو۔ اب مجھے رونا نہیں ہے۔

''اب کچھ تو سُننا ہے تمہیں۔ جذباتی مت بنو۔''

ایسی ڈھیٹ ہڈی تھی کہ سر پر چڑھی چلی آ رہی تھی۔ لعن طعن کرتے کرتے بھی داستان لے کر بیٹھ گئی تھی۔ لاکھ کان بند کرتی اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ تو بولے چلی جا رہی تھی۔

غرناطہ کی تاریخ کا تو سنسنی اور ہیجان خیزی میں جواب نہیں۔ قدم قدم پر سانس روکتی ہے۔ شازشوں اور شازشی کرداروں، دھوکہ فریب اور پیار ومحبت کی جھوٹی سچی کہانیوں سے لبالب بھری ہوئی۔ یہ غرناطہ صدیوں پرانا شہر کوئی پانچ ہزار سے بھی قبل کے زمانے کا۔ اس کے وہ پرانے کھنڈرات جو Iberian oppidum دور سے ہیں وہ بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

شہر نے جب اپنی ذات کا آغاز کیا تو نسبت سپین کے قدیمی نام ابرائین سے ہی کی۔ اِسے تب غرناطہ ال جہد کہا جاتا تھا۔ اسی سے بعدازاں Granada ہوا جس کا ہسپانوی زبان میں مطلب اناروں سے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ بھی تو ایک انار ہی طرح ہے۔اپنے کلچر اور ثقافت کی مٹھاس اور تاریخ کی ترشی لیئے۔

تاریخ اگر غرناطہ کے محمد بن الاحمر کو اس کی تمام تر دلیری اور شجاعت کی داد دیتی ہے تو وہیں اُسے سقوط اشبیلیہ کا کچھ ذمہ دار بھی ٹھہراتی ہے۔کون تھا یہ محمد بن الاحمر؟ قرطبہ کے ایک علاقے کا قلعہ دار۔مگر ذہین، باشعور، بہادر اور جی دار۔وہ جان گیا تھا کہ شکست اور تباہی قرطبہ کے مسلمانوں کا مقدر ہو چکی ہے۔اندر ہی اندر ایک مضبوط فوج کی تیاری اور پھر غرناطہ پر قبضہ اس کی ترجیح بنا۔

شاید کہیں اس کی غیر معمولی فراست، اس کا ادراک یا وجدان نام کی کوئی تیز حس اُسے اشارہ دیتی تھی کہ غرناطہ سپین کے مسلمانوں کی آخری پناہ گاہ ہوگا۔تو حالات اور وقت کی نزاکت نے کہیں عیسائیوں سے گٹھ جوڑ کو مناسب سمجھا اور کہیں اس نے تلوار اٹھائی اور جی داری سے اٹھائی۔اور یہی وہ تھا جس نے بنی نصر خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔

قرطبہ کا زوال لگ بھگ کوئی 1236 میں ہوا اور اشبیلہ پورے بارہ سال بعد۔تو اب جائے پناہ کہاں تھی اِن بدقسمت مسلمانوں کے لیئے۔لے دے کے غرناطہ رہ گیا تھا۔تو اسی کی جانب بھاگے۔اُندلیسہ کے اسی بچے کھچے ٹکڑے کو محمد بن الاحمر نے اپنی جائے عافیت جانا اور اپنی ساری توانائیاں اس کی تعمیر و ترقی میں لگا ئیں۔دیکھتے ہی دیکھتے قرون وسطیٰ کے یورپ کا یہ امیر ترین خوبصورت شہر بن گیا۔

غرناطہ کے معماروں اور ہنرمندوں کا چرچا اسپین میں ہی نہیں پورے یورپ میں تھا۔اُن کے محلات، باغات، عمارتوں، بازاروں کا کوئی جواب نہ تھا۔کیا سائنس، کیا ادب، کیا آرٹ، کیا موسیقی سبھوں میں شہر نے نئے رنگ دیئے۔نئے انداز دیئے اور یورپ میں اپنا مقام بنایا۔

یہی وہ لوگ تھے جنہوں آرٹ کی فنکاریوں سے سجا ہوا الحمرا بنایا۔ نام کے بارے بھی چند روایتیں ہیں۔ یہاں کی مٹی سُرخ تھی جس میں لوہے کے ذرات شامل تھے۔ بنانے والے کے نام کے ساتھ بھی الاحمر کا سابقہ لگا ہوا تھا۔

تو جب شہر اور ملک اور ریاستیں اپنی معراج کو پہنچ جائیں تو پھر زوال بھی امر ربّی ہے کہ کائناتی نظام کی بنیاد اسی حقیقت کہ ہر عروج را زوال پر قائم ہے۔ محلاتی شازشیں شروع ہو گئیں، وراثت کے جھگڑوں، جتھہ بندیوں، امراء وزرا کے مفادات، معاشیات کی بربادی اور بغاوتوں نے عیسائی فوجوں کو دعوت دی۔

ایک گروہ امیر ابوالحسن اور اس کی رومن کیتھولک عیسائی بیوی ثریا کی حمایت میں سرگرم تھا۔ دوسرا گروہ ابوعبداللہ محمد boabdil بیدل ابوالحسن کی دوسری مسلمان بیوی عائشہ کے بیٹے کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ عبداللہ کی بغاوت نے راہ ہموار کر دی۔ عیسائی فوجیں ایک کے بعد ایک قصبے، گاؤں فتح کرتی بالآخر الحمرا آ پہنچیں۔

آٹھ ماہ یہ محاصرہ جاری رہا۔ اب جھکنے اور بندوقیں رکھنے کے سوا کوئی چارہ کار تھا۔ یہ تو فاتح قوم کی مرضی ہے کہ وہ آپ کی درخواست منظور کر لے۔ تیس ہزار طلائی سکوں کے عوض آپ، آپ کے اہل خانہ اور عزیزوں دوستوں کو سلامتی سے جانے دے یا پھر وہیں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائے یا کولہو میں پسوا دے۔

ایسا ہی ہوتا ہے۔ مذہبی طور پر ایذا رسانی کا سلسلہ تو جلد ہی شروع ہو گیا۔ یہودیوں پر نزلہ تو فوراً گرا۔ اُن کی دربدری پورے سپین سے فوراً ہو گئی۔ ہاں البتہ مسلمانوں پر قسطوں میں یہ عتاب نازل ہوا۔ سترھویں صدی تک اُن کا بھی صفایا ہو گیا۔

ہاں البتہ وہ شہر، وہ ریاست جو تہذیب و ثقافت کا مرکز تھی۔ جس نے دنیا کو بہت کچھ دیا۔ قابل، لائق اور ہنرمند افراد کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اس نے غرناطہ کو تاریکیوں

میں دھکیل دیا۔

ایک طویل عرصہ اِس کیفیت میں رہنے کے بعد شہر نے انگڑائی لی۔ اس کے صاحبان اقتدار نے محسوس کیا کہ ثقافتی وروحانی طور پر اسے زندہ کرنے کی ضرورت ہے کہ سیاحوں کی اِن علاقوں میں کثرت سے آمد اور دلچسپی ملک کے لیئے بے حد سودمند ہوسکتی ہے۔اس کے توانا اسلامی تہذیبی ورثے نے سٹیج سیٹ کرنے کا اہتمام کر دیا تھا۔

شہر نے ایک اور آفت کا بھی سامنا کیا جب نیشنلسٹوں نے شہر پر قبضہ کرلیا اور خانہ جنگی شروع ہوگئی۔4000 ہزار لوگ چلے گئے یا پھر مارے گئے۔ان ہی مرنے والوں میں سپین کا شاعر گارشیالور کا بھی تھا۔

اور جب بیریئر سٹینڈ ایک طرف کرتے ہوئے داخلے کا اذن ملا اور لوگوں کے ہجوم میں ہم بھی شامل ہوئے تو جیسے کہیں میری یادوں میں The Fall of Granada فلم کے وہ منظر رینگنے لگے جو کوئی چھ صدیاں قبل ایسے ہی ایک دن کا منظر ہوگا۔

''تو کیا یہی وہ دروازہ تھا۔''میں نے خود سے پوچھا تھا۔

ہاں میری معلومات نے سر ہلایا تھا۔''ہاں یہی۔جس سے فاتح جرنیل گھوڑے پر سوار اپنے فوجیوں کے ساتھ قومی جھنڈا لہراتے ہوئے داخل ہوئے تھے۔ دروازے پر کھڑے عرب دربانوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے نیزے زمین پر مارتے ہوئے انہیں اندر جانے کا راستہ دیا تھا۔تعاقب میں ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرنینڈ ڈ گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ چلتے داخل ہوئے تھے۔

کیا یہی وہ گیٹ تھا جس نے زوال کے اِن لمحوں کا سامنا کیا۔خود سے ایک بار پھر سوال تھا۔

یقیناً یہی تھا۔جی چاہتا تھا ذرا رکوں۔اس کا پٹ پکڑوں اور پوچھوں۔تمہیں کیسا

لگا تھا؟ اُف کتنا تفاخر تھا ان کے چہروں پر۔ کتنا جوش اور خوشی رقصاں تھی وہاں۔

اب سینکڑوں سال بعد اُس عہد ساز زمانے کے سرد وگرم چشیدہ عروج زوال کی خوشیوں، غموں کے امین دروازے میں قدم رکھتے ہوئے میرا دل بوجھل سا تھا۔ یہ تب ٹاور آف جسٹس کہلاتا تھا۔

اس وقت کے مسلمان بادشاہوں نے اِس کی پیشانی پر لکھوا رکھا تھا۔

''اِس جگہ آپ کو انصاف ملے گا۔'' اور یہ حقیقت تھی کہ مظلوموں کو انصاف ملتا تھا یہاں۔

چاروں طرف نگاہیں جیسے طواف کی سی حالت میں تھیں۔ ڈیوڑھی سے آگے محل کا پہلا حصّہ ہے۔ یہ کورٹ آف جسٹس جسے Mexuar کہا جاتا ہے۔

کمرہ در کمرہ انسان کو آرٹ اور فن کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتا تھا۔ اس پر حیرت کے جہاں وا کرتا ہے۔ چھتیں دیواروں کے بالائی حصّے قرآنی آیات سے سجے ہوئے ہیں۔ اب اِن میں سے کچھ کو شعرا کا کلام بھی کہا گیا ہے۔ کچھ قرآنی آیات کا کہتے ہیں۔ تاہم اپنایت، لگاؤ اور محبت کی خوشبو چہار سمت محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال نہ اتنی عربی کی سمجھ بوجھ ہے کہ تمیز کر سکتے۔ ہاں البتہ کچھ کچھ پڑھا جا رہا تھا۔

عظیم الشان گنبد کو دیکھ کر آنکھیں پھٹتی ہیں۔ سنہری حروف میں ولا غالبُ الا اللہ بہت نمایاں ہے۔ نگاہیں اِن حروف پر جمی ہیں۔ گنبد کی گہرائی میں فنکاری کے ستارے، دائرے، چاند کیسے رقصاں ہیں۔

اب کلیجے سے ٹیسیں سی اٹھنے لگی ہیں۔ کچھ یاد آیا ہے۔ دماغ کہیں تاریخ کی بھول بھلیوں میں الجھنے لگا ہے۔

اشبیلیہ ڈھے رہا تھا اور محمد بن الاحمر کو احساس ہو رہا تھا کہ اشبیلیہ کے بنی حمود کا

ساتھ دینا تو گویا اس کے حسابوں اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔اُس نے غرناطہ پر اپنے قبضے کو تسلیم کروانے کی قیمت عیسائیوں کا ساتھ دے کر کی تھی۔

اقتدار مسلّم ہو گیا تھا۔لوگوں نے غالب کا خطاب دیا۔ندامت میں گھڑ گیا۔حکم دیا غالب صرف اللہ ہے۔اسے ہی بولا جائے یہی لکھا جائے۔محل میں دیواروں پر یہ تحریر اس کے اسی جذبے کی عکاس تھی۔

اس نے اپنے چہرے کو داغ دار ضرور کرلیا مگر آنے والی صدیوں میں غرناطہ مسلمانوں کی عظمتوں کا پیامبر بن گیا۔

تاہم یہاں سوال اٹھتا ہے تدبّر اور فراست اہم ہیں مگر غیرت اور حمیت کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم۔اس نے اپنے اقتدار کو بڑھا کر اڑھائی سو سال تک پھیلا لیا۔زوال تو پھر بھی مقدر کا حصّہ بنا۔سقوط غرناطہ اسلامی تاریخ میں اپنی المناکیوں کے ساتھ درج ہوا۔

مجھ پر یاسیت کا حملہ پھر ہونے والا تھا۔کوفت سے میں نے خود کو سُنایا۔

’’بند کر یہ عروج وزوال کے باب جو تو کھول بیٹھی ہے۔ہر عروج رازوال تو ایک سکہ بند حقیقت ہے۔‘‘

گردو پیش پھر نگاہوں کی زد میں تھے۔بعض جگہ دیواریں صاف تھیں۔کہیں پڑھا ہوا یاد آیا تھا کہ متعصب لوگوں نے دیواروں پر اپنے ہاتھوں کی پہنچ تک اِن آیات کو مٹا ڈالا۔سب سے زیادہ متاثر یہ حصّہ ہوا تھا جسے عیسائیت کی پوشاک پہنانے کی ہر کوشش کی گئی۔شاید اُس وقت انہیں یہ علم نہ تھا کہ یہ بیش بہا خزانہ آنے والے وقتوں میں ان کی اولادوں کے لئیے سونے کے انڈے دینے والی مرغی جیسا ہوں گے۔

دوسرا حصّہ Comares کہلاتا ہے۔یعنی شاہی دربار۔کمال کی فنکاری بکھری ہوئی تھی یہاں۔فوارے، بہتا پانی، سبزہ، پھول، کمروں کا حسن تعمیر، قرآنی آیات کی کندہ

کاری۔

میں گُم سم کھڑی سلطنت غرناطہ کے اِس اہم حصّے جہاں اہم فیصلے ،اہم احکامات، غیر ملکی شاہ وسفراءصدیوں تک آتے رہے کو بغور دیکھ رہی ہوں۔میری آنکھیں بھٹکے آہو کی مانند چہار جانب گھومتی پھرتی ہیں۔مسندِ شاہی پر بیٹھے بہت سے کردار اپنے تصوراتی ہیولوں سے بصارتوں کی زد میں ہیں۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں وہ جیالا کمانڈر انچیف غرناطہ موسیٰ بن ابی غسّان آخری تاجدار غرناطہ ابوعبداللہ اور دیگر اکابرین سلطنت کو کھڑے ہونے اور عیسائیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے مائل کرر ہا تھا۔مصالحت کی ہر تجویز کو وہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینک رہا تھا۔

''نہیں نہیں مجھے نہیں قبول۔کوئی شرط،کوئی معاہدہ۔ میں غرناطہ کا دفاع کروں گا اپنی آخری سانس تک۔میرے لیے عزت سے مرنا زیادہ اہم اور پسندیدہ ہے بہ نسبت ایک محل میں ذلت کی زندگی گزارنا۔

شیر کی مانند دھاڑتی یہ آواز میری سماعتوں سے ٹکراتی تھی۔ مجھے پھر جذباتی دورہ پڑنے لگا تھا۔ٹپ ٹپ دو آنسو میری آنکھوں سے نکلے۔فوراً میں نے انھیں پلّو سے صاف کیا۔

افسوس صد افسوس کِسی نے اُسے نہیں سُنا۔وہ سب صلح کا فیصلہ کر بیٹھے تھے۔غسان اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا۔دشمنوں کے ساتھ لڑتا کیئوں کو جہنم واصل کرتا دریائے Xamil میں کود کر تاریخ میں خود کو امر کرتے ہوئے یہ پیغام دیتا گیا۔کہ صلح کے بعد بھی ذلت تو مقدر بنی۔کچھ ہرج تھا اگر عزت کی موت کو ترجیح دیتے۔مگر ایسا تو جذبہ ایمانی پر ہی ممکن تھا۔

ملکہ کے کمرے، جھروکے۔سامنے کے مناظر، کمرے میں بنی جالی جس کے نیچے عودولوبان جلتے اور خوشبوسارے کمرے کومعطر کرتی۔

ارونگ کی کہانیاں کیسی سحر انگیز ہیں۔واشنگٹن ارونگ Irvan ایک امریکی جو سفارت کار ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ دان، مضمون نگار اور کہانی کار تھا۔ وہ رپ وین ونکل Ripvan Winkle اور ایسی ہی کئی کہانیوں اور مجموعوں کا خالق۔ایسا تاریخ دان اور محقق کہ پیغمبر انسانیت محمدؐ، جارج واشنگٹن اور آلیور گولڈسمتھ پر لکھنے والا۔الحمرا اور اسپین کے مور اس کے مطالعے کے مخصوص موضوع تھے۔1829 میں غرناطہ آیا حکام سے درخواست کی کہ اُسے الحمرا میں رہنے کی اجازت دی جائے کہ وہ اِس ماحول میں رہتے ہوئے لکھے گا۔اور یہ حقیقت ہے کہ اُس نے اپنی کہانیوں میں وہ ماحول دکھانے کی پوری کوشش کی۔

وہ لوگوں کو ڈھونڈتا اُن سے ملتا اور پھر کہانیاں تخلیق کرتا۔ بڑی طلسماتی کہانیاں محلاتی سازشوں میں گندھی، توہمات میں سانس لیتی، عقیدے اور یقین کے ساتھ چلتی ہوئیں۔اُن کے ملبوسات، اُن کی شاہی پوشاکیں، ہیروں سے چمکتے دمکتے تاج، کنیزیں اور خدام۔مشکی گھوڑے، چاندراتیں ایک داستان طلسم ہوش ربا۔یہ طلسمی ماحول اپنی شاہانہ عظمتوں کے ساتھ آج بھی اِس سیاحت کے دوران محسوس کیا جاسکتا ہے۔

حمام یہاں سے قریب ہی ہیں۔ ملکاؤں کے نہانے کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات، فوارے سے پانی کے گرنے والی آوازوں کی موسیقیت اور بالا خانے کے ٹیرس پر بیٹھے موسیقاروں کے سازوں سے پھوٹتی مدھر دُھنیں کیسے شام کا بانکپن بڑھاتی تھیں۔

اس کا آخری حصّہ کہنے دیجئیے سب سے حسین اور سب سے حیرت انگیز کورٹ آف Lions ہے۔الحمرا کی تصویریں جب بھی دیکھیں نصر سلطنت کا یہی حصّہ نمائندگی کرتا

سامنے آیا۔

سچی بات ہے میں کنگ کھڑی تھی اُسی طرح جیسے 1442 کے اس دن جب وہ سب فاتح کی حیثیت سے اس حصّے میں داخل ہوئے تھے۔ مسیحی جرنیل، اس کے مشیروں بادشاہ اور ملکہ کی آنکھیں پھٹی تھیں۔ وہ مبہوت بنے اِس عظیم تعمیراتی شاہکار کو دیکھتے تھے جس کے ایک ایک ستون کی کندہ کاری فنکاری کے راز کھولتی تھی۔ سوال کرتی تھی کہ وہ کون سے ہاتھ تھے جنہوں نے اسے تراشا اور کِس طرح تراشا۔ کیسے اِسے یہ شکل دی۔ وہ کون سے دماغ تھے جنہوں نے اسے یہ صورت دینے کی منصوبہ بندی کی۔

محرابوں کی صورت، اس کی جھالروں کے کٹاؤ، اُن کے اوپری حصّے، اُن کی چھتیں ہر حصّہ منقسم ایک نئی منفرد کندہ کاری کا نمائندہ۔ رنگوں کا انتخاب سادگی اور پُرکاری میں بے مثال۔ ستونوں کے پہلو ہر پہلو اپنی ساخت میں منفرد اُس الہامی پیغام سے سجا جس کی تزئین وخطاطی آپ کے قلب وجگر کو تہہ و بالا کرتی اور آپ کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔ کہتے ہیں شاعروں کا تو وہ حال تھا کہ انہوں نے لکھ لکھ مارے دیوان جیسے کام کیئے۔

سچ تو یہ تھا۔ یہ حیران کرتا کچھ کہتا جیسے کہ میں واقعی حیرت انگیز ہوں۔ جیسے میں زمردوں کے تھال میں پڑا موتی ہوں، جیسے کسی خوبصورت حسینہ کا دل ہوں، جیسے کسی رومانوی کمپلیکس کا رومانوی ساحصّہ ہوں۔

میرا جی چاہتا تھا میں کہیں بیٹھ جاؤں۔ اِن بارہ شیروں سے جن کے دہانوں سے کبھی مسلسل پانی موتی برسایا کرتا تھا۔ زمانے سے اپنے ان سروں پر حوض کا سارا بار سنبھالے ہوئے ہیں۔ اُن سے پوچھوں، اُن سے کہوں۔ کچھ سُناؤ مجھے اُن وقتوں کا احوال جب تیرے اِس آنگن میں شہزادے، شہزادیاں اور کنیزیں پھرتی تھیں۔ کتنی داستانیں تم دن رات سُنتے ہوں گے۔ تم نے وہ وقت بھی دیکھا ہوگا جب نئے لوگ نئے حکمران یہاں آئے

تھے۔تم نے اِسی محل میں جہاں اذانیں گونجتی تھیں۔ جہاں مسجدوں کے نشان تھے۔تم نے تثلیث کا نغمہ سنا ہوگا۔کہیں آنکھوں سے کوئی آنسو ٹپکا تھا؟ کہیں چہرے پر حُزن و یاس کے جذبات بکھرے تھے؟ بتاؤنا مجھے۔

ہاں مجھے تو ایک اور بات بھی تم سے پوچھنی ہے۔ ذرا قدم اٹھاتے ہوئے تمہارے صحن سے اس شاندار کمرے میں تو جھانک لوں۔ارونگ نے بڑی ہیبت ناک کہانی سُنائی ہےاور تفصیل کچھ یوں ہے۔

مولائی حسن کی محبوب بیوی ثریا سے ابن سراج قبیلے کے سردار کا جنونی سا عشق تھا۔ایک دن خلیفہ نے باغ میں دونوں کو حالت محبت میں دیکھ لیا۔طیش بہت تھا۔تاہم اپنی رسوائی کے پیش نظر خاموش رہا۔موزوں وقت دیکھ کر قبیلے کے سرکردہ لوگوں کو کھانے پر بلایا اور اِسی کمرے میں سب کو قتل کر دیا۔

کمرے کے حسن و جمال اِس کے منفرد روشن دانوں، ان سے آتی روشنی اور ہوا کے جھونکوں کو محسوس کرتے ہوئے میں نے پوچھا تھا بتاؤنا۔کیا واقعی ایسا ہوا تھا ابوعبداللہ اور اس کے باپ مولائی حسن ، ماں عائشہ،سوتیلی عیسائی ماں ثریا کے درمیان تنازعے کا باعث یہی واقعہ تھا۔یا پھر یہ تاریخ کی گپ شب ہے۔

جھروکوں سے باہر کے منظر بھی بڑے دلفریب تھے۔البیازین کی بستی نیچے ڈھلانوں پر بکھری کتنی خوبصورت نظر آتی تھی۔ یہ مسلمانوں کی بستی تھی۔ یہاں مور رہتے تھے۔

جھروکوں کی کندہ کاری کا بھی جواب نہ تھا۔واشنگٹن ارونگ کی کہانیاں پھر یاد آئی ہیں۔یہیں کہیں ایسے ہی کسی جھروکے سے عائشہ نے ابوعبداللہ کو ٹوکری میں بیٹھا کر نیچے اُتارا تھا۔

یہیں کہیں وہ جگہ بھی ہوگی کہ جہاں کھڑے یا بیٹھے اُس چارلس پنجم نے کہا تھا۔

بڑا ہی بدنصیب تھا وہ ابوعبداللہ بیدل جس سے یہ سب کچھ چھن گیا۔

یہیں مجھے کولمبس کی یاد آئی تھی۔ ارونگ نے اسی جگہ کا تو ذکر کیا ہے کہ وہ یہاں کھڑا ملکہ ازابیلا کے حضور عرضی پیش کرتے ہوئے کہتا تھا۔

ملکہ عالیہ نئی دنیاؤں کی دریافت میں میری مدد کیجیے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے تاج کے ہیروں میں ایک اور قیمتی ہیرے کا اضافہ ہوگا۔

سوچتی ہوں کس قدر بصیرت کا مالک تھا وہ بوڑھا ملاح۔ اپنے حسابوں وہ جو کچھ ڈھونڈنے نکلا تھا۔ اُس سے کتنی اعلیٰ وارفع چیز قدرت نے اُسے عنایت کی۔ ملکہ ازابیلا کے قابل ذکر کارناموں میں ایک اور اہم کارنامے کا اضافہ ہوگیا۔

کتنا کچھ یاد آیا تھا۔ میں ایک بار پھر اپنی نوخیز جوانی کے نوسٹلجیا کے سحر میں گم ہوئی۔ نسیم حجازی کا اُندلس کے پس منظر میں لکھا ہوا ناول۔ اف اس کا وہ انداز بیان اور میرے جیسی جذباتی لڑکی۔ رو رو کر بے حال ہوگئی تھی۔ ماں پوچھتی تھی۔ تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ ماں کو کیا بتاتی؟

کہیں اس وقت معلوم تھا کہ ایک دن میں وہاں کھڑی جبل الشہدا کو دیکھ رہی ہوگی۔ جہاں اُس نوجوان منحنی سے جسم والے ابوعبداللہ نے غرناطہ کی کُنجی فرڈینیٹڈ کو دی تھی جس نے خود جذبات سے مغلوب اُسے اپنی ملکہ کو پکڑایا تھا۔

وہ ابوعبداللہ رخصت ہوا۔ کچھ آگے جا کر پہاڑی سے مڑا۔ اپنے تعاقب میں نگاہیں دوڑائیں۔ اس کی سلطنت، اس کا شاندار ویگا، الحمرا کے باغ باغیچے، برج، فصیلیں اور وہ سب شان وشوکت کے لازمے۔

''اللہ اکبر''

اُس کے ہونٹوں سے نکلا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔اور پھراس کی ماں عائشہ نے تاریخ میں امر ہوجانے والے جملے کہے۔

’’جس چیز کوتم مرد ہوکر نہ بچا سکے۔اب اس کے لیےعورتوں کی طرح روتے ہو۔‘‘

’’موروں کی آہ۔‘‘یہی وہ پہاڑی ہے جسے مقامی لوگوں نے یہ نام دے دیا تھا۔

باغات والے حصّے میں بھی بہت وقت گزرا۔ کھجور کے درختوں نے جگہوں کی رعنائی بڑھادی تھی یا پھر ہماری نظروں اوردل میں اِس سے محبت کی وہ چاہت تھی جسے نام دینا ذرامشکل ہے۔جگہ جگہ بیٹھتے، باتیں کرتے ،اپنے جیسے حُلیوں شکلوں والےلوگوں سے آگے بڑھ کر ملتے جن میں راجستھان کا وہ ہندو خاندان بھی شامل تھاجومحبت سے ملا۔ پہلے اُس نے اپنی حکومت کولعن طعن کی پھر پاکستان کے بڑوں کورگیدا۔

’’یہ دونوں سالے عام لوگوں کے ملنے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ہم ملیں۔‘‘ہمارے جذبات بھی ایسے ہی تھے۔دونوں طرف سے خوب خوب بھڑاس نکلی۔ہم عوام جنتا بس بولنے اوربکواس کرنے جوگی ہی ہے۔اب آگے بڑھے۔اف خدایا شام بھی اب سرمئی پیرہن میں لپٹی دھیرے دھیرے الحمرا کے درودیوار پر پھیل رہی تھی۔ سچی بات ہے اس نے الحمرا کا حُسن اور بڑھا دیا تھا۔اتنے تھکے ہوئے تھے کہ قدم اٹھانے دوبھر ہورہے تھے۔دفعتاً ایک گاڑی پاس سے گزری جسے میں نے ہاتھ کےاشارے سے روکا۔ سیما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ دل کی مریض ہیں پلیز انہیں گیٹ تک لفٹ دے دیں۔گرتے پڑتے جگہ جگہ رُک کر دم لیتے تھوڑا سا ٹانگوں کوسکون دیتے بالآخر گیٹ پرپہنچ گئے۔ٹیکسی پکڑی اورمنزل پرپہنچ گئے۔

☆☆☆

باب نمبر:7 غرناطہ کا دل البیازین

- البیازین یا قدیم عرب کو اٹرز موریش تہذیب وتمدّن کا عکاس علاقہ ہے۔
- باب رمبلا، باب سکیلیز اور باب انارسب کا دیکھنے سے تعلق ہے۔
- غرناطہ کے بیشتر گرجا گھروں کی تعمیر مسجدوں پر ہوئی ہے۔

ہم دونوں کے مقابلے پر وہ بہت زیادہ کمزور بدن اور ہڈیوں کے سنگین قسم کے آسٹروپروس کا شکار تھی۔ پولیو کی باقیات تو اس کے جسم کا پکا پکا حصّہ بنی بیٹھی تھیں۔ ایک ٹانگ ذرا گھسیٹ کر چلتی تھی مگر کیا جذبوں والی زنانی تھی۔ ہمہ وقت سفر کرنے کی دل دادہ اور اِدھر اُدھر منہ ماری کی بھی بے حد شوقین۔

ہم کہیں جا رہے ہیں، کہیں بیٹھے ہیں۔ اُس نے آگے بڑھ کر یا اُٹھ کر اجنبی لوگوں سے باتیں کرنا شروع کر دینی ہیں۔ جگہوں کے بارے پُوچھ گچھ رائے تبصرے، نئی معلومات واپس آکر ہمارے علم میں اضافہ کرنا۔ فلاں جگہ کی بہت تعریف کی جا رہی ہے بھئی وہاں تو ضرور جانا ہے۔

آج غرناطہ میں ہمارا آخری دن تھا۔ کل صبح دس بجے اِس خوبصورت تاریخی شہر جسے ابن بطوطہ نے شہروں کی دُلہن کہا تھا الوداع کہنا تھا۔ اس وقت جب ہم ناشتہ کرتے ہوئے آج کا پروگرام مرتب کر رہے تھے جس میں سرفہرست البیازین کا سیر سپاٹا، رائل چرچ اور دیگر مقامات تھے۔ اس نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

’’Sacriomonte‘‘ضرور جانا ہے۔فلیمنکو رقص دیکھنا اوران کا گانا بھی سُننا ہے۔

اس کے پاس پوری تفصیلات تھیں۔مختلف پیکج کی تفصیل ۔28یورو میں پک اینڈ ڈراپ سروس اورشو کے ساتھ ڈرنک بھی۔

تو اگر یہ ڈرنک شراب ہوئی جس کا99%امکان ہےتو کیا کرو گی؟

’’کرنا کیا ہے؟وہ طمطراق سے بولی تھی۔میں کھڑی ہوکر کہوں گی میں مسلمان ہوں اورشراب نہیں پیتی۔مجھے فریش اورنج جوس دیا جائے۔اور یہ میری دونوں ساتھی انہیں بے شک دے دیں۔یہ بڑی لبرل ہیں۔‘‘

’’ہاں ہاں مسلمان تو خیر سے تم ہی ہو ہم تو ہندو ہیں،عیسائی ہیں،کافر ہیں۔ہمیں شراب جائز ہے۔‘‘ہماری ساری بکواس وہ ہنستے ہوئے اپنے سر سے ہوا کے کسی سرکش جھونکے کی طرح گزار رہی تھی۔اور ہاں دیکھو52یورو میں کھانا اورسیر سپاٹا بھی ہے۔‘‘

’’تم زیادہ سمارٹیاں مت بکھیرو۔بہتیرے سیر سپاٹے کرلیئے ہیں۔چلو اٹھائیس (28)یوروٹھیک ہیں۔‘‘

بڑی لکھنے والیاں بنی پھرتی ہیں۔معلوم ہے وہاں کچھ لوگ اسی پر بات کرتے تھے کہ وہ تو پہاڑیوں میں چھپا ہوا جم ہے۔اور ہاں میں نے نکولس سے بات بھی کرلی ہے۔اب جا کر اُسے پیسے دیتے ہیں۔وہ بکنگ کروا دے گا۔‘‘

’’چلو ٹھیک ہے۔‘‘ہماری طرف سے سب ٹھیک ہے۔اچھا ہے کا سگنل تھا۔

’’ٹیکسی پکڑو۔‘‘

سیما کا نادر شاہی حکم تھا۔اس ہوپ ان ہوپ آف سے وہ ناکوں ناک آئی پڑی تھی۔چڑھنے اُترنے کا بہت مسئلہ تھا اُسے۔خیر مسئلہ تو یہ ہمارا بھی تھا۔چلو ذرا شدت کم تھی۔

تو پہلا معرکہ رائل کھیتڈرل کو دیکھنا تھا جو پہلے مسجد تھی۔ بمشکل پانچ منٹ میں ٹیکسی ایک ایسی جگہ رُکی جہاں ایک عظیم الشان عمارت رائل کھیتڈرل چرچ کی صورت دیکھنے کی دعوت دیتی تھی۔ اسے قبول کرتے ہوئے ہمارے انداز میں باہر آئے شوق ووارفتگی کے ساتھ ساتھ کہیں دُکھ اور ملال کی بھی آمیزش تھی۔

پہلی نظر کھیتڈرل کے سامنے کھلے میدان میں داہنے ہاتھ کے کونے میں چرچ کو جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی ایک سانولی سلونی خاتون اور پاس بیٹھی نوعمر لڑکی پر پڑی جو من و عن ماں کی جوانی کا عکس تھی۔ اور اپنی وضع قطع سے سو فی صد پاکستانی یا ہندوستانی دِکھتی تھیں۔ اب سیدھے ان کی طرف لپکے۔

یہ عذرا تھی۔ حیدرآباد دکن کی عذرا۔ ثانیہ مرزا کے شہر کی جم پل جو اب بنگلور کی یونیورسٹی میں فزکس کی اُستاد تھی۔ بیٹی تھیٹر سے وابستہ تھی۔ فلم میکنگ کے لیئے امریکہ جانے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ شہرہ آفاق فلم ساز، شاعر اور ادیب گلزار کے ساتھ بھی تھوڑا بہت کام کیئے بیٹھی تھی۔ ماں اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیئے آئی تھی۔ بہت محبت سے ملیں۔ بڑی بیٹی اندر جانے والی قطار میں لگی کھڑی تھی۔

مہر النساء ٹکٹ لینے گئی۔ ''کبھی کی مسجد'' اِس کے منہ ماتھے پر نظریں جماتے ہوئے بے اختیار ہی دُکھ بھرے لہجے میں میرے ہونٹوں سے نکلا۔ عذرا کے لہجے میں بھی تاسف کی جھلک تھی کہ عبادت گاہ کسی بھی مذہب کی ہو اس کی تکریم اور حفاظت انسانیت کا تقاضا ہے۔

''بھئی نئی بناؤ۔ اُسے رہنے دو۔ اسے کیوں چھیڑتے ہو؟

تبھی مہر النساء نے آکر بتایا کہ ٹکٹ بک ہیں۔ بڑا ملال ہوا جی چاہتا تھا اندر جا کر دیکھیں تو سہی کہیں کوئی باقیات ہیں بھی یا تعصب کی بھینٹ نے سب نشان مٹا دیئے ہیں۔

عذرا نے ذرا دلداری کی کہ کل کی کوشش کر لینا۔

''ارے کل تو واپسی ہے۔'' سیما نے کہا۔ چلو اب اِس کا گردونواح دیکھ لو۔ ساتھ ریشم مارکیٹ ہے۔

سیما اور مہرالنساء دونوں خوشی سے کھل اٹھیں۔ عذرا کو خدا حافظ کہتے ہوئے چرچ سے ملحقہ گلی میں داخل ہوئے۔ رنگ و حُسن کا ایک طوفان امنڈا ہوا تھا وہاں۔ دکانیں تھڑوں تک پھیلی ہوئی تھیں اور سیاحوں کے پُرے خدا کی قسم ہمارے ہاں کے اُس منظر کے عکاس تھے کہ جب ہمارے بچپن میں نذر و نیاز کے بٹوارے کے لیئے صدائیں لگتیں۔ بالو، بلونگڑوں، نیانوں نیج ونڈی دی لے ای جاؤ۔

یہ منظر بھی من و عن اُسی کا عکاس تھا۔ کیا کیا چیزیں نہیں تھیں۔ عورتوں کو پاگل بنانے والی سب چیزیں گو یہاں مُفتے والا کوئی سلسلہ نہیں تھا بلکہ کھلڑی اُدھیڑنے والی بات تھی۔ مگر لوگ تھے کہ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ اُن دونوں کو اس میں اُلجھا دیکھ کر میں تو قرب جوار کی گلیوں میں تانکا جھانکی کرنے لگی۔

کیا حسن تھا۔ جو نظروں کو گرفت میں لیتا تھا۔ دکانیں چھوٹی چھوٹی ،گلیاں تنگ تنگ مگر کوئی شان و شوکت تھی۔ سرسراتے مکھن جیسے نرم اور حسین رنگوں میں لُتھڑے رنگا رنگ ملبوسات کا طوفان دوکانوں سے باہر امنڈا پڑا تھا۔ گلیاں کہیں محراب دار شگافوں سے آگے کھلتیں۔ بھول بھلیوں کی دنیا جس میں گم ہو جانے کا ڈر تھا اور مجھے کوئی ایسا رسک لینا منظور نہ تھا۔

منظر بالکل ہمارے پرانے لاہور کا سا تھا۔ ہمارے یہاں کمی تھی تو سلیقے طریقے کی۔ یہاں بانکپن تھا۔ وہاں کوفت اور بیزاری تھی۔ کھوتے ریڑھے، گوبر لیدیں اڑتے پھرتے کاغذ، شاپروں کے غبارے گند کے یہ نظارے ہمیشہ کوفت میں مبتلا کرتے تھے۔

بہرحال یہ بات بھی مزے کی لگی کہ یہاں دکانوں پر ففٹی سے زیادہ عورتوں کی

حکمرانی تھی۔

مراکش کے دو لڑکوں سے ملاقات ہوئی۔ پاکستان سے ہیں۔ جان کر دل کی گہرائیوں سے ''الحمداللہ'' نکلا۔ آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ نے اپنایت کا احساس دیا۔ میرے پوچھنے پر کہ کون سی چیزیں ہمیں دیکھنی چاہیں۔ اُس نے مجھے کاغذ پر لکھ دیں۔

جب واپس لوٹی دونوں اسی دکان میں گھسی ہوئی تھیں۔ تقریباً چالیس اور پچاس یورو کی شاپنگ سے دونوں کی تشفی ہوگئی تھی اور اُن کے اِس طعنے کو کمینی، کنجوس دو یورو کی کوئی سوغات تو بھی لے لے۔ کسی میز پر دھری کسی جگہ سجی یاد کا ہی وسیلہ بنتی ہے۔''

میں بھی ڈھیٹوں کی طرح ہنسی اور بولی۔

''تم اپنی نبیڑو میری چھوڑو۔ دو قدیم تاریخی عمارتیں دو قدم پر ہیں انہیں دیکھ لیں۔ اگر تمہاری تشفی ہوگئی ہو تو۔''

مارکیٹ کی بغل میں ہی قدیم اسلامی درسگاہ تھی۔ اب ماضی آنکھوں کے سامنے تھا۔ زندگی کا کون سا شعبہ ایسا تھا جس میں اُندلس کے مشاہیر نے نام نہ پیدا کیا اور دنیا کو نہ نوازا۔ دنیا کا عظیم مفکر، فلاسفر، ماہر تعلیم ابن خلدون بھی یہاں پڑھاتا تھا۔

شہرہ آفاق سیاح ابن بطوطہ بھی یہاں آیا تھا۔ غرناطہ کو جو خراج تحسین اس نے دیا وہ تاریخ کے سینے میں محفوظ ہے۔ غرناطہ اُندلس کے سب شہروں سے زیادہ حسین ہے۔ اس کے دریائے شینل، اس کے باغ باغیچے اور محل باڑیوں سبھوں نے مجھے متاثر کیا۔ یہ اُندلس کا دمشق ہے۔ یہ شہروں کی دُلہن ہے۔

قریب ہی ایک سرائے تھی ویران اجڑی ہوئی۔ بڑے سے صحن کے گرد خالی کمرے۔ ایک دو کمروں پر دوکانوں کا گمان گزرا۔

الحمرا کی چھتر چھاؤں میں بسنے والی پہلی قدیم ترین آبادی البیازین جسے قدیم عرب کواٹر کہا جاتا ہے۔حسن وخوبصورتی کا نمونہ،تنوع کی وراثت کی حامل جس پر غرناطہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔البیازین وہ قابل فخر ورثہ ہے جو غرناطہ کا جز وبدن ہونے کے باوجود اپنی منفرد پہچان کا حامل ہے۔

اسے جب تک انسانی آنکھ سے نہ دیکھا جائے اس کے حُسن کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔سپین کے خودمختار صوبے اُندلیسہ کے غرناطہ جس کا ایک ضلع یہ البیازین ایسا حسین و جمیل ٹکڑہ ہے کہ جسے جتنا دیکھو اُتنا کم۔تنگ تنگ خم دار گلیوں والا یہ البیازین جو مورش تہذیب وتمدّن کے آغاز سے سجا قرون وسطیٰ کا حُسن آنکھوں کے سامنے مجسم کرتا ہے۔

البیازین کے جس محرابی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے وہ گیٹ اف Puerta Elvira قدرے سرخی مائل بھورا تھا۔نام کے بارے بہت سی روایات ہیں۔مجھے تو صرف ایک حقیقت کے قریب تر لگی تھی کہ جب لگ بھگ کوئی تیرھویں صدی کے کم وبیش وسط میں مسلمانوں کو بیاز Baeza شہر سے عیسائیوں نے دیس نکالا دیا تو وہ بھاگ کر غرناطہ کی اِن شمالی پہاڑیوں پر آباد ہو گئے اور انہوں نے اِس مضافات کو اپنے پرانے شہر کا نام دیا۔جسے آج البیازین کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ال کذابا Alcazaba تھا۔اور قرطبہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کی طاقت کا سارا مرکز غرناطہ بن گیا۔شہر خوبصورت مسجدوں سے سج گیا۔یہ کوئی آٹھ دس نہیں،پچیس تیس کے لگ بھگ تھیں۔خوبصورت مکانات،بازار محرابی بڑے بڑے چوبی پٹوں والے گیٹ یا باب،ڈھلانی گلیاں،موروں کے تہذیبی وثقافتی ورثے کی عکاس۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بستی کا روپ دھار گئی جو آج بھی اپنی اسی انفرادیت کے ساتھ قائم ہے۔

یہاں کے بہت سارے چرچ تو وہ ہیں جو مسلمانوں کی مسجدوں پر بنائے گئے ہیں۔بعض خوبصورت مینار بیل ٹاور بنا دیئے گئے۔اِن میں سب سے خوبصورت اور حسین Al Minar de San Colegitaاور اس کا صحن تھا جو کہ کبھی مسلمانوں کی بہت بڑی مسجد تھی۔جو چرچ آفdel Salvadorسے منسلک کر دیا گیا تھا۔

چرچ کی یہ کہانی اس ظلم وزیادتی کو بہت اچھی بتاتی ہے کہ اسلام کو عیسائیت میں بدلنے کے کیا کیا جتن ہوئے۔اور ان کے اپنے شہر میں مسلمانوں اور ان کے ساتھ ساتھ یہودیوں پر بھی ظلم وستم کے کون کون سے پہاڑ نہیں ٹوٹے۔

اس گیٹ سے اندر داخل ہونا گویا اس عہد قدیم میں داخل ہونے کے مترادف تھا۔یہاں کہیں کہیں دیواروں پر بکھری خستگی اور کہنگی بھی نظر آئی۔کہیں بلند وبالا پتھریلی اینٹوں اور پتھروں کی سیڑھیاں جو گھروں کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھتی چلی جاتی تھیں۔پھول پتے بیلیں گملے بھی آنکھوں کو طراوت دیتے تھے۔جس گلی میں جاتے کچھ نہ کچھ وہاں مختلف ہی نظر آتا۔کہیں کوئی محرابی دروازہ توجہ کھینچتا۔کہیں گلی یا تنگ دہانہ کسی الف لیلوی داستان کی طرح پھولوں سے چمکتے کسی میدان میں دھکیل دیتا۔کہیں چونے اور گچ میں گندھے مکان نظر پڑتے۔

البیازین۔یہ کیسا جہان اور کیسی دنیا تھی۔قدامت کے حسن میں پورم پور ڈوبی۔نئے رنگ کے پینٹ پالش رنگ وروغن کے غازے میں لپٹی ہوئی۔ورلڈ ہیرٹیج کی گود لی ہوئی۔عربوں کے شاندار ورثے کی مالک۔

شائقین کا ہجوم تھا۔بیگ کندھوں سے لٹکائے جتھوں کی صورت پروانوں کی طرح اس کی گلیوں میں منڈلاتے پھرتے تھے۔کہیں گھروں کی بالکونیاں اور فرنٹ کی دیواریں آرائشی نوادرات سے سجی آپ کی آنکھوں سے اشارے بازیاں کرتی تھیں۔کہیں کشادگی اور

کہیں اتنی تنگی کہ دومنزلہ سہ منزلہ گھروں کی بالکونیوں اور دریچوں سے ذرا سا ہی ہاتھ بڑھانے سے سالن اور چائے کے کپ کا لین دین ہوجائے۔مکانوں کی چھتیں اور چوباروں کی کھڑکیاں ایک دوسر کے گھر میں گویا کھلتی تھیں۔گلیوں کے نام کہیں چونکاتے تھے۔گوبگڑے ہوئے تھے مگر ذرا ساز ور دینے اور تھوڑی سی فکر ماضی سے ناطہ جوڑ دیتی تھی۔

کہیں پیڑوں پر سجے سنگترے، مالٹے۔ہائے جی چاہتا تھا توڑ کر کھائیں۔کہیں سے لون مرچ مل جائے تو چٹخارے بھرتے ہوئے بچپن آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔کہیں چڑھائی ،کہیں اُترائی ،کہیں پھول ،کہیں بیلیں،کہیں پیڑ،کہیں درخت۔سب اس کا حسن بڑھانے کا باعث ہیں۔

سب سے زیادہ لُطف سان نکولس چرچ کے احاطے میں آیا جہاں اونچی منڈیر پر ٹورسٹوں کے پُرے بیٹھے ان رنگ رنگیلے جپسیوں کے فلیمنکو گیت اُن کے گٹاروں پر سُنتے تھے۔اِس منظر کا حصّہ بننے میں ہم نے لطف اٹھایا۔یہیں دھوپ میں بیٹھ کر ہم نے اپنے مخصوص ریسٹورنٹ سے بنوایا ہوا ویجی ٹیبل پیزا کھایا۔کوک پی۔سامنے الحمرا کے جھلکیاں مارتے نظارے دیکھے۔لڑکے لڑکیوں کو ایک دوسرے سے مستیاں کرتے دیکھ کر لُطف اٹھایا اورخوش ہوئے۔

آبادیوں میں گیٹ یا باب دوسرے لفظوں میں داخلی دروازے رکھنا عرب فن تعمیر کی شاندارسی روایت رہی ہے۔عرب تمدّن اور تہذیب کی نمائندہ اِس بستی میں بھی کئی باب ہیں۔حوض ہیں،حمام ہیں۔جن کی بلندو بالا محرابوں سے اندر جانا،حوضوں سے پانی پینا بہت مزے کا کام تھا۔

تو گھومتے پھرتے باب رمبلا Gate of Bibarrambla پر جا پہنچے۔ عربی میں یہ باب رملہ ہے۔ایک نام Arch of the ears بھی ہے۔یہ اس شکستہ

دیوار کے پاس ہی ہے جس کے اب صرف کہیں نشان رہ گئے ہیں۔گیٹ کے شکستہ حصے غرناطہ میوزیم میں اپنی تاریخ کے ساتھ سجے ہوئے ہیں۔یہ الحمرا کے جنگلات میں بائیں باتھ تاروں والا گیٹ پار کرنے کے بعد تھا۔

پلازہ باب رملہ کو دیکھنا بہت مسرور کن تھا۔اس کا سارا رنگ ڈھنگ بہت مشرقیت کا حامل تھا۔آہنی سیاہ گرل والے احاطے میں تین خوبصورت پیڈسٹلوں پر کھڑا فوارہ بھی کیا رنگینی بکھیر رہا تھا۔

یہ دراصل اندلس اور سپین سٹائل کا خوبصورت سکوائر ہے۔یہ غرناطہ کے اہم حصّوں کی urban تاریخ کی بہترین نمائندگی کا عکاس ہے۔اس کا آغاز نصر دور سے شروع ہوتا ہے۔جب یہ شہر کے مرکزی دروازوں سے منسلک تھا۔مسجد بھی قریب اور منڈی بھی قریب۔بہت شاندار لوکیشن۔اس میں سقوط غرناطہ کے فوراً بعد ہی بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔بہت سے اس کے اردگرد گھر بھی گرائے گئے تاکہ بڑا ہوسکے۔اس کے کونوں پر تنگ تنگ گلیاں ملتی ہیں۔

سولہویں صدی تک یہ پبلک تقریبات کا بڑا مرکز رہا۔یہاں کھیلیں۔بیلوں کی ڈوریں، جلسے جلوس شاہی تقریبات پھاہے، پھانسیاں اور اناج پھل سبزیوں کی منڈی تھی۔

گیٹ اف سکیلز کو بھی دیکھا کیا بات تھی اُس دور کے حکمرانوں کے انتظام سلطنت کی۔ایک ڈیوڑھی نما محرابی راستہ اُس مارکیٹ میں لے جاتا تھا جہاں کسی دکان دار کی مجال نہ تھی کہ اس کے ناپ تول کے پیمانے مقرر کردہ سرکاری پیمانوں سے مختلف ہوں۔اگر کوئی جرم کا ارتکاب کرتا تو اس کا سب مال ومتاع بحق سرکار ضبط ہوجاتا۔فرد جرم باب سکیل کے منہ پر چسپاں کیا اور جی بھر کر ذلیل کیا جاتا۔

The gate of Pomegranate بھی اپنے تعمیری طرز کا شاہکار

دروازہ ہے۔جس کے سر کی چوٹی پر انار دو حصّوں میں تقسیم ہو کر اپنے رسیلے دانوں کی نمائش کرتا ہے۔ یہ چارلس پنجم کے محل کی تعمیر کے وقت تعمیر ہوا۔روایت ہے کہ تین اناروں سے امن اور خوشحالی کو نمایاں کرنے کی کاوش تھی۔مگر وہ جو اژدھے منہ پھاڑے گاٹیاں نکالے نظر آرہے تھے اُن کو کیا نام دیں۔محرابی صورت چیک پوسٹوں پر مستعد دربان کھڑے تھے۔

ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ایسے میں جب ہوپ آف ہوپ آن پازیبیں بجاتی کِسی نئی نویلی دلہن کی طرح نمودار ہوئی تو گویا باچھیں جباڑوں تک پھیلنے والی بات تھی۔ ہاتھ دیا اور ایک دوسرے کو کھینچ کھانچ کر چڑھنے کی کی۔

پورا چکر کاٹ کر جب اُس نے رُخ بدلا تو ندی کے ساتھ ساتھ کشادہ سی گرین بیلٹ پر ڈھابوں کا ایک جمعہ بازار نظر آیا۔بڑا افسوں خیز سا ماحول تھا۔عقب میں بلند و بالا تاریخی دیوار نظر آرہی تھی۔

''چلو چلو اُترو۔'' پیٹ کے چوہے بلیوں نے شور مچایا۔

تو جوان خوبصورت من موہنے سے لڑکوں کے جتّھے لپکے۔مُدّعا عرض کیا کہ حلال کھانا چاہیے۔چار لڑکوں نے سینوں پر ہاتھ رکھے۔کورنش بجالائے اور ''الحمداللہ'' مسلمان ہیں کا نعرہ مستانہ بلند کیا۔

جگہ منتخب کی۔میز پر قبضہ جمایا۔مینو پر نگاہیں ڈالیں۔کچھ پلّے نہ پڑا۔

''ارے بھئی تم ہی کچھ مدد کرو۔اور ہاں یاجوج ماجوج کی طرح سر پر کیا تنے کھڑے ہو۔پیچھے ہٹو۔سانس لینے دو ہمیں۔

دونوں نے رٹو طوطے کی طرح بولنا شروع کر دیا۔مینو کارڈ پر انگلیاں پھرنے لگیں۔''یہ کھایئے۔اِس کی پلیٹ منوایئے۔''

اب سارا معاملہ اُن کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

''اف'' جب سروس شروع ہوئی ۔میز پلیٹوں سے سجی تو دیکھا میرے سامنے چھوٹی سی مچھلی منی چنی آنکھوں والی اپنے سارے وجود سمیت کیسری چاولوں کے درمیان دھری تھی۔

دہل کر پلیٹ کو دیکھا یہ کیا؟ گھبرا کر پوچھا۔لڑکا ہنسا۔نام اُلٹے پُلٹے ہشکلیں ٹیڑھی میڑھی، ذائقے بےسوادے۔اب زہر مارنے والی بات ہی تھی نا۔

بڑے تیز لڑکے تھے۔سیما نے ہوا میں اڑتے اپنے بالوں کو کیچر کی گرفت میں لانے کے لیے بازوؤں کو اوپر اٹھایا۔ایک لڑکے نے'' واؤ'' کا زوردار نعرہ لگاتے ہوئے آنکھیں کچھ اس انداز میں مٹکائیں کہ جن کا سیدھا سیدھا مفہوم تھا کہ بھئی بڑی طرحدار عورت ہے۔میری تو ہنسی چھوٹ گئی۔

''سیما بھئی تیری تو آج بھی بڑی مارکیٹ ویلیو ہے۔''

واش روم کے لیے وہ ہمیں کم وبیش کوئی پچاس سیڑھیاں چڑھا کر اس گھر میں لے گئے جو اِس ڈھابے کے مراکشی مالک کا تھا۔خوبصورت نوجوان ۔دو بیویاں ، ماشاء اللہ درجن بھر بچے اپنے اور کچھ اتنے ہی اِدھر اُدھر کے برادر ملکوں کے جو اس کے پاس کام کرتے تھے۔

ہائے افزائش نسل کی بڑھوتری پر مسلمانوں کا کتنا زور ہے۔ہاں ہماری مسلمانیت سے انہیں بڑی محبت محسوس ہوئی ہے۔قہوے سے تواضع اور پورے خاندان نے تصویریں بھی بنائیں۔

☆☆☆

باب نمبر:8 سیکرومنٹو کے جپسی اور اُن کی غاریں

- o کھوتے کھوڑے اُن کی کُھرلیاں پھٹے اور الف لیلیٰ کی کہانیوں والی سرائیں سب بیچ باچ کر اطمینان اور سرشاری سے سوتی رہی۔
- o تماشائی بھی یورپ کی نازک اندام چھوکریاں چھوکرے اور موٹی مٹیاریں اور دیوہیکل رانجھے تھے۔خدا کی قسم ایسے من چلے، چُلبلے اور زندہ دل کہ طوفان اٹھا دیا۔
- o سیکرومنٹو کی وجہ شہرت جپسیوں کی وہ غاریں ہیں جواب کہیں تو میوزیم بنی ہوئی ہیں اور کہیں کمرشل ناچ گانوں کا مرکز ہیں۔

بس تو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی گہرے غبار کے اندھے کنوئیں کی پنہائیوں میں تہہ در تہہ اُترتی چلی جا رہی ہوں۔ ایلس ان ونڈر لینڈ کی طرح میرے سامنے نئی نئی راہیں اور راستے کھلتے چلے جا رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے جیسے میرے جسم کا ہر عضو ایک لطیف سی آرام دہ کیفیت کی آسائش میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ تو اس کیفیت میں کب تک ڈوبی رہی یقیناً ساری رات۔ تو بس ساری رات سوتی رہی اور بس سوتی رہی۔

کھوتے کھوڑے اُن کی کُھرلیاں پھٹے اور الف لیلیٰ کی کہانیوں والی سرائیں سب بیچ باچ کر اطمینان اور سرشاری سے سوتی رہی۔

ہاں کہیں کہیں جیسے محسوس بھی ہوا تھا یا شاید یہ واہمہ تھا کہ جیسے آس پاس اردگرد میرے چاروں اور مکھیاں سی بھنبھنا رہی ہوں۔

جیسے کوئی دور سے بہت دور سے پکار رہا ہو جیسے کوئی کہتا ہو۔

''اٹھ جاؤاب۔ چلنا نہیں کیا؟''

مجھے تو رتی برابر بھی یاد نہیں۔ پر وہ دونوں مُصر ہیں کہ تم نے ایسے ہی اور یہی کہا تھا۔ بڑبڑ کرتے ہوئے۔ کچھ خود سے اور کچھ اُن سے۔

اگر کوئی مجھے اس وقت یہ کہے کہ اٹھو تمھیں پاکستان کی وزارت عظمیٰ پر فائز کرنا ہے۔

اُف تو میں کہوں گی اس منحوس ماری لعنتی سوغات کو تو تم اپنے پاس ہی رکھو۔ ہمارے یہ کسی کام کی نہیں۔ ہائے بس سونے دو۔ میری تو نیند ہی میری ہفت اقلیم ہے۔

تو کیا انھوں نے مجھے جھنجھوڑا تھا۔ اور مجھے لعن طعن بھی کی تھی۔ کی ہوگی یقیناً مجھے تو کچھ یاد نہیں۔

صبح سویرے جب اٹھی تو دونوں کے خراٹے گونجتے تھے اور شاید وہ دونوں بھی اس کیفیت میں تھیں کہ جس سے میں رات گذری تھی۔

نماز کے بعد پھر سو گئی۔ کہ روانگی تو گیارہ بجے تھی۔ اب جب دوبارہ آنکھ کھلی تو پہلی آواز سیما کی تھی جس نے ملامت کے تبرّوں سے نوازتے ہوئے کہا

''تم نے اتنی خوبصورت، اتنی انوکھی، اتنی نرالی اور اتنی شاندار چیز مِس کی کہ جس کا قلق تمہیں ہمیشہ رہے گا۔ وہ تو ایک ایسی دنیا تھی کہ جو خوابوں میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ہائے تم نے کیا کیا؟''

اب موبائل کے بٹن آن ہوئے اور میری آنکھوں کے سامنے حیرتوں کا جہاں وا ہوا۔

''لو بھئی یہ تو میرے ساتھ ہاتھ ہو گیا۔ اٹھائیس یورو بھی گئے اور ایک نئے

دلفریب منظر نامے سے بھی محروم ہوئی۔محراب درمحراب غاریں تھیں یا کوئی تعمیری جدتیں تھیں۔تصویروں سے سجے رنگوں میں سمائے لوگوں سے بھرے کمرے جہاں وہ الف لیلیٰ کی کہانیوں کی اپسرائیں محوِ رقص تھیں۔موسیقی کی ابھرتی ڈوبتی تانیں تھیں۔

یہ شو La-Zambra de Maria La-Camasbra میں انہوں نے دیکھا تھا۔غرناطہ کی شاید قدیم ترین غار میں اور یہاں ہونے والا شو بھی اپنی طرز کا منفرد اور شاندار تھا۔

بڑی بڑھ بڑھ کر بڑھکیں مار رہی تھیں دونوں۔

گٹار بجانے والوں کے جوش وجذبے اور لگن پر بھی آفرین اور وہ فلیمنکو زبان کا سنگر۔زبان تو پلے نہیں پڑ رہی تھی مگر آواز تھی کہ کلیجہ نکالے دیتی تھی۔تان اٹھاتا تو لگتا جیسے آسمان تو ابھی سروں پر گرا سو گرا۔دل ڈوبنے لگتا جب نشیلی آواز کا سُر دھیرے دھیرے گرتا۔

وہ رقص کرتا جوڑا ان کی ادائیں اور بانکپن، سچی واری صدقے ہونے کو جی چاہتا تھا۔ہائے کہنے کو گورات تھی مگر روشنیوں میں، گل رنگ چہروں اور خوشیوں میں جھومتے مختلف النوع انسانوں کے ہجوم میں لپٹا ماحول کس قدر طلسمی اور رومانوی تھا کہ بندہ تو خود کو گویا ہواؤں میں ڈولتا جھومتا محسوس کرتا تھا۔

تماشائی بھی یورپ کی نازک اندام چھوکریاں چھوکرے اور موٹی مٹیاریں اور دیوہیکل رانجھے تھے۔خدا کی قسم ایسے من چلے، چُلبلے اور زندہ دل کہ طوفان اٹھا دیا۔

حد ہو گئی تھی۔بکواس ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔میرا اندر جیسے بھٹی میں بھنتے دانوں جیسا ہو رہا تھا۔لگتا تھا کہ بس ابھی تڑخا سو تڑخا۔کان بھی تپنے لگے سُنتے سُنتے۔اس وقت ہم لوگ ناشتہ کر رہے تھے۔

میں چیخی۔

’’اب اگرتم لوگوں نے اپنی بکواس بند نہ کی تو خدا کی قسم میں یہ پلیٹیں اٹھا کر تمہارے سروں میں دے ماروں گی۔حرامزادیاں۔‘‘

میں نے ساری اخلاقیات اٹھا کر چولہے میں جھونک دی تھی۔دونوں مکاری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کرمسکرائی تھیں۔سیمانے پرس میں سے بروشرز نکال کر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

’’چلو جو ہوا سو ہوا مٹی پاؤ۔تمھارے مقدر میں اگر اس دلکش رات سے محرومی تھی تو اس میں ہمارا دوش نہیں۔انہیں پڑھ لینا۔تمھاری تھوڑی بہت تشفی شاید ہو جائے۔‘‘

اب یہ تو اُن دونوں کا کہنا تھا کہ تم تو بھنگ پی کر سوئی تھی۔رات کا پہلا پہر تھا۔جب اپنے ہونٹوں پر لالی اور بالوں میں کنگھی پٹی کرتے کرتے بھی آوازیں دیتے تھے کہ اٹھو چلنا نہیں کیا مگر کرتے کیا؟ تمھارے تو خراٹے یوں گونجتے تھے جیسے انجن سڑک کی روڑی کوٹ رہا ہو۔آدھی رات آگے اور آدھی پیچھے جب ہم آئی تھیں تب بھی ایک بار پکارا تھا مگر اب مردوں کو مات دینے کی شرط کو جب کوئی خود کے لیئے چیلنج بنا لے تو بھئی ہمارا قصور تو نہ ہوا نہ۔

پہلے تو جی چاہا کہ کاغذوں اور بکلیٹ زBooklets کا یہ پلندہ اٹھا کران کے منہ پر ماروں۔پھر غصے کو بھگاتے ہوئے اپنے آپ کو ڈانٹا۔

’’اب زیادہ بھی اچھل کود کی ضرورت نہیں۔وہ کیا کرتیں۔قصور تو تمہارا اپنا ہے۔‘‘

تو یہ Sacromonte کون ہیں؟ بھلا کب غرناطہ آئے؟اب کہیں تو درج ہے کہ سولھویں صدی کے لگ بھگ ان کا نزول ہوا۔

سیکرومنٹو کی وجہ شہرت جپسیوں کی وہ غاریں ہیں جو اب کہیں تو میوزیم بنی ہوئی

ہیں اور کہیں کمرشل ناچ گانوں کا مرکز ہیں۔ اگر ان کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا جائے تو جپسی کوئی اولین لوگ نہیں تھے جنھوں نے غاروں کے منہ متھے سیدھے کیئے۔ دراصل یہ عرب تھے جنھوں نے Valparaiso کی پہاڑیوں کی نرم زمین کو کھدائی کے لیئے موزوں سمجھا اور وہاں قدرتی غاروں کو رہائشی صورت دی۔ جپسیوں کی اس علاقے میں آمد سقوط غرناطہ کے بعد ہوئی۔

اس کی جائے وقوع کا حسن جہاں پہاڑوں کے دلکش نظارے، چراگاہیں دریا اور مختلف قوموں کے ثقافتی ورثے پر مشتمل ایک انوکھا اور حیرت انگیز اثاثہ آپ کو محظوظ کرنے کا منتظر ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے رنگا رنگ تہذیبی اور نسلی امتیازات کے ساتھ جس میں عربوں، یہودیوں، ہسپانیوں اور جپسیوں کے امتزاج کی رنگینی اپنے منفرد پس منظر کے ساتھ شامل ہے۔ آپ پر طلسم سے بھرا ایک جہان وا کرتے ہیں۔

یہ لوگ جب یہاں آئے تو غاروں کو اپنا مسکن بنا بیٹھے۔ آغاز میں پہاڑوں کی قدرتی ساخت کی چھوٹی موٹی، کہیں ٹیرھی میڑھی غاروں میں رین بسیرا ہوا۔ وقت کے ساتھ تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ بدلتے زمانے کے رجحانات نے انہیں بہت کچھ سکھایا۔ غرناطہ کی سیاحت میں اب ایک اہم کردار ان کا بھی ہے کہ یہ غاریں سڑک نزدیک ہونے کی وجہ سے انسانی پہنچ کی دسترس میں ہیں۔ یہودیوں کی طرح یہ لوگ بھی اپنے حسب نسب کے کھرے اور اپنی سچی حقیقی شناخت کیلئیے بہت محتاط رہتے ہیں۔ کہہ لیجئیے ہمارے پاکستان کے کیلاشی فرقے جیسی صورت ہے۔ بس یہاں ذرا ماڈرن ازم اور یورپی تڑکے ہیں۔ فلیمنکو گانے اور رقص پر مشتمل اِن قبائل کا ایک اپنا ورثہ ہے۔ اُندلس میں قیام نے اس میں جدت پیدا کی۔ غار میں کوئی سو سے ڈیڑھ سو تک کی گنجائش تھی۔

☆☆☆

باب نمبر:9 قرطبہ کے لئے روانگی

- قلاھورا قلعہ تین قوموں کے تہذیبی ورثے کا حامل تھا۔
- عربوں نے کوئی نیوٹن اور کوپرنیکس پیدا نہیں کیا مگر یورپ کو وہ کچھ ضرور دے دیا کہ جس کے بغیر ان کی پیدائش ممکن نہ تھی۔
- کوریڈارا اپنی وسعت اور عمارتی حسن کے اعتبار سے ایک نادر شے نظر آتی ہے۔

اگر یہ غرناطہ کا ریلوے اسٹیشن تھا تو بس ایویں سا ہی تھا۔کسی اچھی سی بس سروس کا اڈہ لگتا تھا۔وسیع وعریض ہال میں اکّا دکّا لوگوں کی آمدورفت ہی جاری تھی۔شاید ہم پہلے آگئے تھے۔ہاں البتہ جب میں واش روم کے لیئے عقبی سمت گئی دیکھا کہ وہاں شاندار قسم کی کئی ٹرینیں ٹریکوں پر کھڑی تھیں مگر مسافروں کی ریل پیل مفقود تھی۔

پھر کچھ لوگوں کی مزید آمد ہوئی۔ بڑے سے ہال کے سناٹے اور تنہائی نے دم توڑا۔چہل پہل کا احساس ہوا۔پھر اشارہ ہوا اور قطار میں کھڑا کیا گیا۔ٹکٹ چیک ہوئے اور عمارت کے باہر کھڑی بس میں لدلدائی ہوگئی۔

غرناطہ کا آسمان بے حد روشن، چمک دار اور نیلاہٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔نشست سنبھالنے پر سکون کا احساس ہوا۔کھڑکی پر تنے پردے ہٹا کر باہر جھانکا تھا۔بس سارے میں سونا ہی سونا بکھرا ہوا تھا اور ہر شے اس میں نہاتی سرشاری تھی۔

الواع غرناطہ۔الواع پیارے شہر۔کبھی تم میرے تھے آج غیروں کے ہو۔چلو

خیر۔ایسا ہی ہوتا ہے۔

کام اور فاصلے اِس قوم کے گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتے اور چلتے ہیں۔جب Antequera پہنچے۔گاڑی اور پلیٹ فارم تک کا مارجن صرف آدھ گھنٹہ کا تھا۔ہال سے گزرتے ہوئے مجھے خیال تو آیا کہ یہاں پانچ منٹ کے لئیے رُک کر کِسی سٹور یا کافی بار سے گاڑی میں منہ ماری کرنے کے لئیے کچھ خرید لوں۔مگر اس سمے وہی بے چینی و بیتابی کا عنصر سر پر سوار تھا۔اور جب پلیٹ فارم پر کھڑے انتظار کے لمحات کا سامنا کیا تو ہڑک اٹھی کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور کچھ لے آؤں۔

سیما سے کہا۔''ابھی آتی ہوں۔''اُس نے ہاتھ پکڑ کر گھُر کا۔

''خبردار چُپکی کھڑی رہو۔ابھی ٹرین آ گئی تو؟''

اور اچھا ہی ہوا۔دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ مہارانی کی آمد ہو گئی۔وگرنہ ہماری حماقتوں اور چٹورے پن سے ایک اور سیاپے نے جنم لے لینا تھا۔

اب ہم ایک ایسی ٹرین میں بیٹھے تھے جس کے ساتھ ہماری زمانوں پرانی ساری فینٹسیاں اُڑنچھو تھیں۔نہ چھک چھک، نہ سیٹیاں، نہ چلنے کے مخصوص انداز۔پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ زمین پر چل رہے ہیں یا بھاگ رہے ہیں۔ہاں البتہ ایک نظارے کی مانوسیت بڑی اچھی لگی۔ہم سے اگلی سیٹ پر بیٹھی صبیح اور سبک سے خدوخال والی خاتون کِسی بچے کا سویٹر بُن رہی تھی۔اون کے رنگ کی ٹھنڈک اور اس کی نرماہٹ چھوئے بغیر ہی اپنا پتہ بتاتی تھی۔ساتھی خاتون سے باتوں کا سلسلہ، تیزی سے ہاتھوں کا چلنا، نئے گولے کا ریپر اُتارنا، اُسے پرس میں ڈالنا، تار کے ساتھ تار جوڑنا ہر ہر انداز میں رکھ رکھاؤ اور سلیقے طریقے کی جھلک تھی۔بہت دلچسپی سے سیما اور میں نے اسے دیکھا اور لطف اٹھایا۔اپنے اور ان کے موازنے میں وہی پنڈ کی کڑی اور ماڈرن تعلیم یافتہ شہری لڑکی کی مثال ہی دی جا سکتی ہے۔

خیال ہے دو یا تین اسٹیشن ہونگے کہ منزل آ گئی۔اسٹیشن کی شان وشوکت کِسی شاندار ایرپورٹ سے کیا ہی کم تھی۔باہر نکلے۔ہواؤں کے لطیف اور زور آور جھونکوں نے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

’’لومری جاتی تھیں نا اِس قرطبہ کے عشق میں۔تو اب ہونا قرطبہ میں۔ہاں علامہ بھی تو پور پور اس کی چاہت میں غرق تھے۔ایسے تو نہیں کہا تھا مولانا غلام رسول مہر سے کہ مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو۔

چلو خوش آمدید اپنے اسلاف کے گم شدہ گھر آئی ہوں۔

ٹیکسی میں بیٹھے تو جذبات کا بہاؤ خاصے زوروں پر تھا۔جس مانوس منظر نے سب سے پہلے توجہ کھینچی وہ جا بجا کھجوروں کے درختوں کی بہتات تھی۔

ان بلند وبالا درختوں نے بھی ستم ڈھایا۔کیا کچھ یاد نہیں دلایا۔تیز ہواؤں کے سرکش جھونکے ان کی دراز شاخوں کو کِس طرح پٹخنیاں دے رہے تھے شاید اُسی طرح جیسے یہاں کے عہد ساز موروں کو ملی تھیں۔

تاہم اقبال تو لبوں پر آ ہی گیا تھا۔

میری آنکھوں کا نور ہے تو میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں میرے لئیے نخلِ طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا صحرائے عرب کی حُور ہے تو
پردیس میں ناصبور ہوں میں پردیس میں ناصبور ہے تو

مگر وہ بھی بڑی شدت سے یادوں میں اُبھرا تھا۔وہ جو عبدالرحمٰن تھا۔امیہ خاندان کا چراغ اکیس سالہ دلیر،جی دار جسے خوش قسمتی اور بلند بختی السفاح کے خونخوار ہاتھوں سے بچا لے گئی تھی کہ وہ تو امویوں کا تخم مارنے پر تل گئے تھے۔

السفاح حضرت محمدؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی نسل سے تھا۔ یہی تھا خاندان عباسیہ کی بنیاد رکھنے والا۔

بہت پرانے وقتوں سے ہی اُندلس کے دو حصّے جغرافیائی اعتبار سے بہت اہم اور خصوصیت کے حامل تھے۔ شمال میں موسم سرد اور علاقے کا بیشتر حصّہ کاشت کے اعتبار سے موزوں نہ تھا۔ وہیں جنوب میں آب وہوا گرم زمین بہتر اور پانی کی افراط تھی۔

اُندلس کے جزیرہ نما کو طارق بن زیاد اور اس کے بربری ساتھیوں نے فتح کیا تھا۔ یوں بربریوں اور عربوں میں کینہ بھی تھا اور سیاست بھی۔ اور اب جب اسلامی سلطنت میں عباسی غالب آئے اور امویوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹے تو اموی خاندان کا ایک شہزادہ عبدالرحمٰن جان بچانے کے لیے فرار ہوگیا۔

بربری ساحلوں پر خجل ہوتا، امید اور خواہشوں کی بارآوری کی دعائیں مانگتا اندلس آ پہنچا۔ یہاں بنوامیہ کے مفرور شاہی خاندان کے لوگوں اور غلاموں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے کو ایمان بناتے ہوئے قرطبہ کے گورنر یوسف کو دھوکے سے صلح پر آمادہ کرتے ہوئے اُس نے شہر پر قبضہ کرلیا تھا۔ تلواریں نیام میں تب ڈالیں جب اُندلس کے سارے اسلامی علاقہ کا فاتح بن گیا۔ ان سب چھوٹی بڑی ریاستوں کے سرداروں کے سر کاٹ کر ان کے کانوں پر ان کے ناموں کی پرچیاں پرو اور انہیں بوروں میں بند کر کے عباسی خلیفہ المنصور کو بھیج دیئے کہ دیکھ لو انہیں۔

ہاں تم نے بغداد کو علم وادب کا گہوارہ بنایا ہے تو قرطبہ بھی ویسا ہی بنے گا۔ دیکھ لینا۔

ایک مدت لگی اُسے شمالی علاقوں کے بربروں کو زیر کرتے کہیں یمنیوں کو ٹھکانے

لگاتے، کہیں اپنے ساتھیوں کا قلع قمع کرتے ،شہروں کو کہیں باغوں ،سڑکوں ،عمارتوں سے سنوارتے ۔قاعدے قانون بناتے ۔کجھور کا درخت لگانا بھی اُسی کا کارنامہ تھا۔اس کے عشق میں شعر کہنا بھی کہ شاعر تھا۔

اور ٹیکسی میں بیٹھی اُن اشعار کو بھی یاد کیا جو اس نے تب کہے تھے جب وہ اسے ہوا میں جھومتے ڈولتے دیکھتا۔اُداس ہوتا، دمشق یاد آتا، اپنا دادا ہشام یاد آتا۔اس کا وہ باغ یاد آتا جو اس نے دمشق میں بنوایا تھا اور جس میں کھیلتے ہوئے اس نے اپنا سارا بچپن بتایا تھا۔

سن اے ہم وطن نخل میرا بیان — میری طرح تو بھی ہے غربت میں ہاں
تیرا بوسہ لیتی ہے غربی ہوا — دکھاتا ہے تو اپنی مشرقی ادا
خیال وطن سے نہیں ہے قرار — بلا قصد رہتی ہے آنکھ اشک بار

شہر کی چند مرکزی شاہراؤں سے گزرتے گاڑی اندر کو جاتی ایک گلی میں مڑی اور SELV نامی ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔خوبصورت اور شاندار تھا۔جدید شہر کے عین مرکز میں۔

خانہ پُری، دستخط، چابی لینے، نقشے پکڑنے کے مراحل طے ہوئے اور کمرے کے رُخ روشن کا دیدار کیا۔کمرہ بس اچھا تھا۔اس پایہ کا نہ تھا جس کا کرایہ بھرا گیا تھا۔بس جب لوگوں کے ہاتھوں میں معاملات ہوں تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔چلو خیر ہم نے کون سے ڈیرے لگانے تھے یہاں۔

کھانے کے لئیے قریبی بڑی شاہراہ پر آئے جہاں کھانے پینے کی دکانوں کے قطار در قطار ڈھیر لگے پڑے تھے۔ہائے کیا مصیبت تھی۔نہ کھانوں کے ناموں سے آشنائی ،نہ ان کے اجزائے ترکیبی کا علم۔اب چاہے جو مرضی رکھے سواہ ہو، حرام حلال ہو۔بس اللہ بیلی کہنے والا معاملہ ہی تھانا۔

اپنی طرف سے تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے حد محتاط انداز میں شوکیسوں میں سجی چیزوں کو اپنے اندازوں سے پرکھتے ہوئے کچھ چیزوں کا آرڈر دیا۔اور جب کوئی گھنٹہ بھر انتظار کے بعد کھانا نصیب ہوا اور چند لقمے بھی منہ میں ڈال لیئے تو جیسے احساس ہوا کہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ پشت کی جانب میز پر ایک دلکش سی لڑکی اکیلی بیٹھی تھی۔اُسے دکھا کر پوچھا کہ اس میں پورک تو نہیں۔

''وہ تو ہے۔''

اُس نے گوشت کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

ماتھے پر ہاتھ مارا۔''دیکھو اتنی بکواس کی تھی کاؤنٹر پر۔اب ہم انگلیاں ڈال کر اُلٹیاں کرنے سے تو رہے۔بھول چُوک تو ہر معاملے میں معاف ہے تو یہاں بھی معافی کا دروازہ کھلا ہے۔

اب یہی تسلی دینی تھی ہمیں خود کو۔سو وہ تو فوراً دے کر اپنے آپ کو شانت کرلیا۔اب اٹھے اور جا کر لہجے میں زمانے بھر کی حلیمی و مسکینی گھول کر بپتا کا رونا رویا۔ساتھ معذرت کے بول بھی بولے کہ ہم تو اسے نہیں کھا سکتے۔ ماننا پڑے گا کہ نہ صرف معذرت قبول ہوئی بلکہ انتظار کرنے کا کہا گیا اور پھر پیزا اور فرائڈ فرائز آئے۔چلو پیٹ پوجا ہوئی۔ پورے تین گھنٹے اِس شغل میں یا کہہ لیجئیے کہ دنیا کے سب سے اہم کام کی نذر ہوئے۔

اب کیا کرنا ہے؟ یہ تو طے تھا کہ مسجد قرطبہ تو کل صبح دیکھنی ہے۔وہاں کہیں کِسی کونے کھدرے میں چھپ چھپا کر زمین پر گر کر سجدہ بھی کرنا ہے۔

تو اب جب ساڑھے تین بج رہے ہیں کیا کرنا اور کہاں جانا ہے؟ میں تو چاہتی تھی کہ ہوپ آن ہوپ آف پر چڑھ جائیں اور کہیں اترے بغیر سارے شہر کے جتنے چکر بیٹھے بیٹھے لگا سکتے ہیں لگائیں اور جب آنکھیں مزید نظاروں کو جذب کرنے سے انکاری ہو

جائیں تب کسی پلازے کے سامنے اُتر کر کچھ منہ ماری کر لی جائے۔کچھ حسن عریاں سے دل پشوری ہو جائے، شاید کچھ تماشے بغیر ٹکٹ لیئے دیکھنے کو مل جائیں۔

دونوں سے بات کرنے کی بجائے میں نیچے اُتری اور کاؤنٹر پر کھڑے لوگوں سے راہنمائی چاہی۔ٹکٹ تو خیر اُن سے ہی مل گئے اور یہ بھی کہ بس کہاں سے ملے گی سب جان لیا۔

پتہ چلا کہ اِس سروس کے دو روٹ ہیں۔جن کے بندھن رنگوں سے جوڑے گئے ہیں۔نمبر ایک نیلی لائن والا ہے جس کی منزل عربوں کے حمام (Baths of Caliphates) سے شروع ہوتی ہوئی مسجد قرطبہ تک لے آتی ہے اور سرخ لائن والی راوَڈل پینارومکا (Rio Del Panoromica) سے شروع ہوتی دریا کی سیر کرواتی ہے۔

اس ساری کاروائی کو بھگتا کر جب کمرے میں آئی تو دونوں نے کہا۔یہ اب جب دن گل ہونے والا ہے ہم لوگ کتنا گھوم پھر لیں گے؟ سترہ یورو کا ٹکٹ۔نری فضول خرچی۔کل صبح یا پرسوں کا رکھ لیتیں۔

''شرم کرو۔سترہ یورو کے لیئے مری جا رہی ہو۔اور وہ جو اتنے نظارے لوٹو گی وہ کِسی کھاتے میں نہیں۔

اور دونوں کی نہ نہ کو اِس کان سے سنتے اور دوسرے سے نکالتے''چلو جی بس تے چڑھو تے موجاں لوٹو۔

یہ ہوپ آن اور ہوپ آف بڑی شاندار ڈبل ڈیکر سرخ جوڑا پہنے ہماری برّصغیر کی عروسی دُلہن کی طرح سجی سنوری قرطبہ کی سڑکوں پر مٹر گشت کرتی دل کو بہت بھائی تھی۔میری اٹلی کے دنوں کی پرانی ساتھی۔

چھوٹا سا شہر کوئی سوا تین لاکھ لوگوں سے بھرا ہوا مگر کتنا خوبصورت اور موہ لینے والا۔ ایک ڈھلتی سہ پہر کا حُسن اس پر شہر کا بانکپن۔ تو بے اختیار ہی اندر نے کہا تھا۔ جھوم اے دل کہ میں قرطبہ میں ہوں۔

قرطبہ دریائے الکبیر Guadalquivir کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ پشت پر پہاڑی سلسلہ درختوں اور سبزے سے بھرا پُرا کسی شاہکار پینٹنگ کا سا تاثر دیتا ہے۔ یہ سپین کا دوسرا بڑا اور لمبا دریا ہے۔ جزیرہ نمائے ابرائیبن میں یہ پانچواں لمبا دریا شمار ہوتا تھا۔

فن تعمیر کا مضبوط ہر دور اور ہر عہد کی داستان سُناتا۔ اس سلونی سی شام میں فن تعمیر کے اس مظبوط اور نادر شاہکار نے ہر دور اور ہر عہد کی داستانیں سنان شروع کر دیں۔ رومن زمانے سے جو شروع ہوا۔ بیچارہ کتنی بار پور پور زخمی ہوا۔ مرہم پٹی، باقاعدہ علاج معالجہ، تندرستی اور پھر کسی نئے عتاب کا شکار۔

بہر حال اِس وقت تندرست نو بر نو ہنستا مسکراتا۔ ملحقہ فٹ پاتھوں پر اجنبی دیسوں سے آنے والوں کو پیار سے دیکھتا اور انہیں اپنے محرابی دروازوں کا دیدار کرواتا، اپنی پن چکیوں کی طرف متوجہ کرتا اور بتاتا کہ دیکھو میرے پانیوں کو موروں نے کیسے استعمال کرتے ہوئے شہر کو گل و گلزار بنا رکھا تھا۔

سچی بات ہے یہ بھی میں نے اسی کی زبانی جانا تھا کہ وہ جو قائم دائم مجھے اِس صورت میں نظر آ رہا ہے تو یہ کارنامہ بھی اُسی عبدالرحمٰن اول کے کھاتے میں ہی جاتا ہے۔ اس کے عین درمیان میں سینٹ رافیل کے مجسمے کو دیکھنے پر مجھے اُکسانے میں بھی اسی الکبیر کا ہی ہاتھ تھا۔ اور ہاں مجھے تو اِس نے ایک اور بات بھی بتائی کہ جب عبدالرحمٰن اول نے میری صورت کو نیا رنگ دیا یعنی مجھے ایک طرح نیا جنم دیا تو جانتی ہو قرطبہ کے باسیوں نے مدہم

مدہم لہجے میں کہنا شروع کر دیا کہ خلیفہ کا اس پر اتنا ڈھیر سارا پیسہ خرچ کرنے کا سارا مقصد اپنی شکار پارٹی کے لیے ہے کہ وہ شکار کا بہت شوقین تھا۔ اور اُسے اسی راستے سے جانا ہوتا تھا۔ مزے کی بات دیکھو اُسے بھی علم ہو گیا تھا اِس بات کا۔ وہ دلیر اور ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ مہربان اور نرم دل بھی تھا۔

جانتی ہو اس نے عہد کیا تھا خود سے کہ وہ کبھی اِس پل سے نہیں گزرے گا اور اپنی آخری سانسوں تک اس نے اِس عہد کو وفا کیا۔

ویسے تو میں عبدالرحمٰن اول کی آل اولاد کا بہت ہی مشکور ہوں کہ ہر ایک نے مجھے توجہ دی۔ تاہم عبدالرحمٰن سوئم نے اِن محرابوں میں فنی مظبوطی کے حوالے سے بہت سی تبدیلیاں کیں اور اِسے فن تعمیر کا نمونہ بنا دیا۔ باغات، خوبصورت عمارات، حمام، عام لوگوں کے ڈھیروں ڈھیر مکانات جگہوں کے ساتھ ساتھ انسانی بدن کی صفائی ستھرائی پر بھی اس نے بہت توجہ دی۔

میرے کاموں میں بیتابی، شتابی و جذباتی پن کا عنصر تو ہمیشہ سے بڑا اہم رہا ہے۔ اُس بس میں سوار ہو گئے تھے جس کی گائیڈ جرمن بولتی تھی۔ پلّے خاک پڑنا تھا۔

''چلو مٹی پاؤ۔ سمجھنے سمجھانے کو گولی مارو۔ بس کانوں کو بند کر لو اور آنکھوں کو کھول لو۔ آنکھیں کھولنا کون سا گھاٹے کا سودا تھا۔ اس سودے کو خریدتے ہوئے جانا کہ شہر تو چرچوں سے بھرا پڑا ہے۔ اسی طرح جیسے کوئی مسلمان شہر مسجدوں اور ہندو شہر مندروں سے بھرا ہوتا ہے۔

عمارتوں کے جلو میں پارکوں اور باغوں میں کھلے رنگا رنگ پھولوں، فواروں، جھیلوں، مجسموں اور روشوں پر چلتے پھرتے لوگوں نے اِس سہانی شام کو ہزار رنگوں سے رعنائی دی۔ سورج کا اپنی منزل پر پہنچنے کا سفر بھی دلکشی کا سامان لیئے ہوئے تھا۔ کسی نخریلی محبوبہ کی

طرح جلوے دکھاتا، مرعوب کرتا، کہیں شاندار عمارتوں، کہیں بلندوبالا درختوں کے عقب میں اوجھل ہوتا اور پھر اچانک کسی کونے کھدرے سے، کسی موڑ سے ایک طلسمی انداز سے طلوع ہوتا اپنے رُخ روشن کا دیدار کرواتا تھا۔

شاپنگ پلازے، شاندار سکوائر چرچ کھیتڈرل اور عربوں کی یادگاروں کے بچے کھچے ٹکڑے جنہیں ہم نے صرف اندازوں سے ہی جانا تھا کہ یہ اُن کی ہی نشانیاں ہیں بس کی کھڑکیوں سے نظر آئے تھے۔شہر کا قدیمی حصّہ اپنی تعمیری انفرادیت، اپنی سفیدی کی تابنا کی اور سیاحوں کے ٹولوں سے کچھ زیادہ ہی دلکش نظر آیا تھا۔

سچی بات ہے یہاں اگر تھوڑا سا ذکر اس عبدالرحمٰن دوم کا نہ ہوتو میرے خیال میں یہ زیادتی والی بات ہوگی۔ اُس نے قرطبہ کو ہارون الرشید کا بغداد بنادیا تھا۔فنون لطیفہ کا دلدادہ۔موسیقاروں، گائیکوں اور شاعروں کا قدردان۔ بغداد کے شہرہ آفاق مغنی اسحاق موصلی کا شاگرد زریاب اس کے دربار کی زینت بنا تھا۔

بغداد سے زریاب کا قرطبہ آنا بھی بڑی دلچسپ داستان ہے۔شاگرد اور استاد دونوں نے ایک دن ہارون الرشید کے سامنے گاتے ہوئے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کچھ اِس انداز میں کیا کہ استادتو منہ تکتا رہ گیا۔زریاب نے سماں باندھ دیا تھا۔اُستاد سے بازی لے گیا تھا۔

اسحاق موصلی سے اب شاگرد کو برداشت ہونا مشکل ہوگیا۔بے اختیار ہی بول اٹھا تھا۔یا تو اِس ملک کو چھوڑ جاؤ یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔زریاب اُندلس آ گیا۔دربار میں پذیرائی ہوئی۔اس کی ذہانت اورفن پر عبور نے سلطان کو بہت متاثر کیا۔اس کے پاس قدیم کہانیوں کا ایک ذخیرہ تھا۔طنبورے میں اس کا کمال عین عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ پانچویں تار کا اضافہ زریاب کی ایجاد ہے۔کہا جاتا ہے کہ کوئی اگر ایک بار اس کا گانا سُن لیتا تھا تو پھر

وہ کسی اور گانا سُننے کے قابل نہ رہتا تھا۔

رومن برج کو ایک بار پھر چاہت سے دیکھا۔دریائے الکبیر کی رعنائیوں سے آنکھیں چار کیں۔گو خودرو گھاس پھونس، جھاڑیاں، پودے سب اُس میٹھی سی شام میں پانیوں کے سیاہی مائل اور دھوپ کے طلائی عکس میں گھل مل کر ایک عجیب سا حسن فضا میں بکھیر رہے تھے۔دھیمے سروں میں بہتے پانی اب ایک نئی داستان کا راگ الاپ رہے تھے۔

آب رواں کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

مسجد قرطبہ کی نشان دہی ہو رہی تھی۔دل نے عجیب سے انداز میں دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔خدا کی عنایت پر احساس تشکر کا بے پایاں احساس۔میں یہاں بھی ہو سکتی ہوں۔ دل مچل رہا تھا اُترنے کو۔مسجد میں گھس جانے کو۔مگر نہیں ابھی نہیں۔بس اُسے ہیلو ہیلو کہا۔منہ زور ہواؤں کو پیغام دیا کہ کہنا کل تم سے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔

میری ایک گندی عادت ہے کہ کسی بھی شہر یا جگہ کا کوئی قیمتی لینڈ مارک ہمیشہ میرے لیے کوئی اہم سوغات کسی نادر تحفے کی مانند محسوس ہوتے ہیں جو قدرت مجھے اِن سے زمانوں پرانی محبت اور فینٹسی رکھنے کے باعث انعام کے طور پر عطا کرتی ہے۔مسجد قرطبہ کے لیے بھی میرے جذبات ایسے ہی احساسات کے غماز تھے۔ان میں کچھ تیزی اور تندی بھی تھی جسے میری تھپکی پر سکون کرنے کی کوشش میں تھی۔صبر صبر۔بے چینی اور اضطراب کاہے کا۔

ہوٹل والوں سے جو نقشے اور بروشر ملے تھے اُن کے ہلکے پھلکے مطالعہ نے قلاھورا Calahorra میوزیم بارے بھی مختصراً بتایا کہ اسکے یہ کنگورے والے بلند و بالا مینار کہیں 1369 میں ہنری دوم نے بنوائے تھے۔آغاز میں تو بس یہ دو مینار ایک محراب کے ساتھ جڑے ہوئے شہر میں داخلے کے واحد ذریعے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

پل کے آخری سرے پر بس رُکی اور ہم نیچے اُتر آئے۔کیا منظر تھا۔چند لمحے تو ساکت کھڑے گردوپیش کو ہی دیکھتے رہے۔سبک خرامی سے بہتے دریا کے پانیوں پر سے تیر کر آتی ہواؤں کی خنکی اور خوشگواری دونوں مسرور کن تھیں۔پن چکیاں کچھ کہانیاں سُناتی تھیں۔پل کے آخری سرے پر یہیں یہ دومنزلہ عمارت والا چھوٹا سا میوزیم جس کی صورت سو فی صد قلعے کی سی تھی نظر آیا تھا۔قلاھورا کا مطلب آزاد قلعے کے تھے یہ بھی پتہ چلا۔اب ٹکٹ لیااور اندر جا گھسے۔

تین قوموں کے تہذیبی وثقافتی ورثے کا حامل میوزیم ہمارے سامنے تھا۔

نویں سے تیرھویں صدی تک اس عظیم الشان شہر نے مسلمانوں،عیسائیوں اور یہودیوں کے تعاون سے جس شاندار تہذیب کو جنم دیا۔اظہار عبدالرحمٰن سوئم نے اِس میں جو شاندار اضافے کیے وہ قابل قدر تھے۔جہانبانی کے انداز جو اس نے اپنائے انہوں نے اس کے عہد کو ایک مثالی اور پوری دنیا میں باعث فخر مقام دیا۔مورخوں نے لکھا قرطبہ عروس اندلس ہے۔اس کا حسن آنکھوں میں سرمہ جیسا، نگاہوں میں نور جیسا ہے،اس کا لباس علوم کے جھنڈے ہیں اور اہل فن کے ماہرین اُندلس کے لباس کی گوٹ ہیں۔

ان سب کا اظہار یہاں بہت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔مزے کی بات یہ تھی کہ اِسے کسی قسم کی کوئی حکومتی سرپرستی بھی حاصل نہیں ہوئی۔یہ سپین اور فرانس کے چند مسلمان اور عیسائی دانشوروں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھی کہ 1931 میں اسے تاریخی اور آرٹسٹک ورثہ قرار دیا گیا اور 1987 میں روجر گریڈی فاؤنڈیشن Roger Garaudy Foundation نے اس کی مالی معاونت کا بوجھ اٹھایا۔

سچی بات ہے تحریر شدہ مواد میں بڑے کُھلے دل سے اِس بات کا اعتراف تھا کہ یورپ کے لوگوں کے لئیے اُندلس کی یہ حیرت انگیز ترقی بہت حیران کن تھی۔اور یقیناً یہ ترقی

موروں کی عمدہ انتظامی صلاحیتوں کی مرہون تھی۔

اُس پینٹنگ نے بڑا متاثر کیا تھا کہ جہاں ایک پادری اُندلس کے حکمران کو کسی بادشاہ کی طرف سے بھیجے گئے تحفے کو پیش کر رہا تھا مسجد قرطبہ کا ماڈل بھی یہاں موجود تھا۔ بڑے کشادہ کمرے میں علم وفن کے میدان کی ایجادات جن میں سرِ فہرست آلات زراعت، موسیقی، صنعت وحرفت، آلات جراحی، آلات موسیقی کیا کچھ نہیں تھا۔ نہال کر دیا تھا اِن سب کی دید نے۔ اس پر طرّہ کہ اِن کے بارے معلومات بھی فراہم کرنے کا بندوبست بڑا اعلیٰ اور جدید تھا۔

آپ سے ابوقاسم الزہراوی، میمون، ابن رشد اور ابن عربی کے مجسمے کانوں میں ہیڈ فون لگا کر بات چیت کرتے ہیں اور آپ اُن سے ان کے کارناموں کے احوال سنتے ہیں۔

اب بریفالٹ کو یاد کرنا تو پڑ جاتا ہے کہ جو حد درجہ فراخ دلی سے خراج تحسین پیش کرتا ہے اُندلسی اشرافیہ اور حکام کو کہ سبھی علم وفن سے جنون کی حد تک محبت کرتے اور اس کے فروغ کے لیئے کوشاں رہتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ عربوں نے کوئی نیوٹن اور کوپرنیکس پیدا نہیں کیا لیکن انہوں نے جو کچھ یورپ کو دیا اس کے بغیر کوپرنیکس اور نیوٹن پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔

دل کا رانجھا جی بھر کر راضی ہوا تھا۔

باہر نکلے تو طبیعت ہشاش بشاش تھی بس میں جا چڑھے اور جب بلند و بالا عمارتوں کی چوٹیوں سے سنہری دھوپ غائب ہوگئی۔ سیما کا اصرار بڑھنے لگا۔ اب اُتر چلو۔ تو پھر ایک خوبصورت منظر سامنے تھا اور ہم نے بھی اُترنے میں دیر نہ کی۔

پتہ چلا کہ کوریڈارا Corredera پلازہ ہے۔ تو بھئی کیا بات تھی اِس پلازے

کی ۔کوئی وسعت تھی یہاں ۔عمارتی خوبصورتی کا ایک سیلاب تھا جو ٹھاٹھیں مارتا تھا۔انسانی حسن کی فراوانی تھی ۔اگر اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ پورے اندلیسیہ میں اِس جیسا ایک بھی نہیں تو بھئی ہم نے مانا کہ واقعی اس پر نظریں پڑتے ہی بے چاری بھونچکی سی ہو کر پتھرانے لگی تھیں۔

☆☆☆

باب نمبر:10 مسجد قرطبہ

- علامہ محمد اقبال نے کہا تھا۔مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھنا۔
- قرطبہ مسجد صدیوں قبل گوتھوں کا معبد، رومیوں کا ٹمپل ،عیسائیوں کا سینٹ ونسنٹ تھا۔
- چارلس پنجم نے مسجد کے سینے پر بنے چرچ کا افتتاح کرتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں کہا تھا۔تم لوگوں نے ایک نایاب چیز کو عام سے چرچ میں تبدیل کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔

ٹھہریئے ذرا۔میری بھی سُن لیں۔ذات کو ہمہ وقت ملامتی طبقہ فکر سے جوڑے رکھنا تو ویسے ہی میرا محبوب مشغلہ ہے۔خود پر تبّرے بھیجنا اور لعن طعن کا کوئی موقع ہاتھ سے نکل جائے کہیں ممکن ہے۔لیکن مسئلہ تو گُرو کا ہے۔گرو بھی ایسا جسے صبح شام گنگنائے یا حوالہ دیئے بغیر بات نہ بنے۔

قربان جاؤں اُن کے اب جب وہ کہیں کہ مرنے سے پہلے قرطبہ ضرور دیکھو تو پھر آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ ہم نمانے سے بندے بھلا کس گنتی شمار میں۔پورے پچیس دن علامہ اقبال نے ہسپانیہ میں گزارے تھے۔چلتے ہوئے دوست کو لکھا تھا۔بس قرطبہ دیکھ لینا اِس سے پہلے کہ دنیا سے جاؤ۔

تو بھئی پھر سچے ہوئے نا ہم۔

قرطبہ میں موجود ہونے کا ایک اپنا نشہ اور خمار ہے۔آخر کیوں نہ ہو۔بھئی اسے

The Place of Gold کہا گیا ہے۔اور سونے سے دنیا کا عشق مشہور ہے۔اس پر طُرّہ مسجد قرطبہ دیکھنے جانا ہے۔یعنی ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا والی بات ہی تو تھی۔

ہاں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہماری مسلمانیت جو بے چاری وطن میں تو بڑی دبی دبی اور مغموم واُداس سی رہتی ہے پر جونہی باہر نکلتی ہے کسی منہ زور سیلاب کی طرح شوکریں مارنے لگ جاتی ہے۔میرا خیال ہے یہی کیفیت میری باقی دونوں ساتھیوں کے ساتھ بھی تھی۔

پس ہم تینوں نے ایک دوسرے سے کہا تھا۔

چاہے گٹے گوڈے سجدے کی اجازت نہیں دیتے اور چاہے فرش کی وہ پاکیزگی کہیں نہیں ہے جس کا پہلا تقاضا مسجد کرتی ہے۔تب بھی کوئی بات نہیں۔

اب جو بھی الٹی پلٹی سوچ، ڈر خوف، اچھابُرا احساس دماغ کو چڑھے اُسے بس اٹھا کر باہر پھینک دو۔دل کی مانو کہ قرطبہ کو دل کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ویسے آپ سے کوئی پردہ تو ہے نہیں۔ سچی بات ہے ہمارے دل کون سا پاکیزہ ہیں۔منحوس مارے دنیا کی طمع اور حرص و ہوس کی غلاظتوں سے اٹے پڑے۔اِن کے ساتھ بھی تو ہم سجدے کرتے ہی ہیں نا۔

بس تو طے تھا کہ پیشانی ٹیکنی ہے وہاں موقع محل دیکھ کر۔

ٹیکسی میں بیٹھتے ہی دل بڑے انوکھے سے جذبات کی اُتھل پتھل میں ڈوبنے ابھرنے لگا تھا۔قرطبہ کی مسجد مسلمانوں کے عہد کا ایک عظیم ورثہ اس کا دیکھنا اپنے مقدر کی خوش قسمتی ہی کہوں گی نا۔

گاڑی نے عین مرکزی دروازے کے سامنے لا کھڑا کیا۔پتھروں کی گلی اپنی کشادگی کے ساتھ قرونِ وسطیٰ کے عہد کے اُس فسوں خیز تعمیری نمونوں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے تھی۔ بلند و بالا کنگورے دار چوکور پتھروں والی دیوار نے جیسے ایک پیغام دیا تھا کہ اندر

جانے سے قبل میری باہر والی صورت تو دیکھ لو۔

''ضرور ضرور۔''تو جب چلنا شروع کیا تو کہیں ممکن تھا کہ اُس کی تاریخ نہ ساتھ چلتی۔اس کی ذرا زیادہ شیخیاں بگھارنے نے میرا ماتھا گھما دیا۔

''سُنو رک جاؤ۔آپے سے باہر نہ آؤ۔میرا ہاضمہ اب جوانی جیسا نہیں جو کبھی لکڑ ہضم پتھر ہضم جیسا تھا۔پراٹھے اور مرغن کھانے کب کے چھوڑ بیٹھی ہوں۔

سچی یہ تمہاری فصیل نما دیوار اس پر طرّہ تمہارے دروازے خواہ وہ پارڈن گیٹ Pardon،ملک Milk گیٹ یا پھر استبان گیٹ Esteban Gate ہوں۔سب تاریخ سے لبالب بھرے ہوئے ہیں۔

اور ہاں اُن کے اوپر بنے جھروکوں کی ایک اپنی تاریخ ہے۔یہ سب خلیفہ سٹائل جیسے حسن وروپ سے سجے اوپر سے سونے پر سہاگہ تمہارا یہ بلند وبالا چوکور مینار ہر جانب سے متوجہ کرتا ہے۔یہ مجھے چلتے چلتے روکتے ہیں۔گو یہ سب بند ہونے کی وجہ سے اپنا آپ میرے اوپر نہیں کھول رہے ہیں۔

پورا چکر کٹنے کے بعد ذرا سستانے کے لیئے اس بڑھاوے پر بیٹھ گئے ہیں جو مسجد کی دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا۔نقشہ کھولا تو احساس ہوا دریا بس دو قدموں پر ہے۔اور تھوڑی سی تفصیل پر بھی نظر پڑی کہ جب قرطبہ موروں کے قدموں میں سرنگوں ہوا تو یہاں بنی عبادت گاہ جو کبھی گوتھوں کے معبد کبھی رومیوں کے ٹمپل میں ڈھلی۔پھر عیسائیوں نے اِسے سینٹ ونسٹ کے نام سے چرچ بنالیا۔رومیوں کے ٹمپل اور عیسائیوں کے چرچ کو مسلمانوں نے مسجد میں بدل دیا۔دمشق کی امیہ مسجد کی طرز پر اس کی بنیاد رکھی گئی۔

بہر حال یہاں یہ کہنا پڑے گا کہ عبدالرحمٰن اول میں رواداری اور اخلاقی اقدار کی پاسداری تھی۔اس نے زور زبردستی والی کوئی کوشش نہ کی۔بلکہ اسے خریدنے کی پیشکش

کی تو پہلے انکار ہوا۔ پھر نصف پر آمادگی کا اظہار اور بعدازاں مزید جگہ منہ مانگے داموں پر بیچی اور خریدی گئی۔قرطبہ کی مکمل فتح ہونے پر خستہ حال گرجوں کی مرمت اور تعمیر نو کے لیے بھی اجازت دی گئی۔

کندہ کاری سے مزین بلند قامت دروازے باب پالمز Palms جسے رحمتوں کی محراب بھی کہتے ہیں سے اندر داخلہ ہوا۔اس دروازے سے مسجد تک رسائی سیدھی تھی مگر ہمیں تو ابھی ڈھیروں ڈھیر کام کرنے تھے۔ پہلا تو یہی تھا کہ برآمدے میں رُک کر نظریں طواف میں مصروف اور دل شکر گزاری کے جذبات میں بہنے لگا تھا۔

سامنے صحن تھا۔ایک جانب ہال اور بقیہ تین جانب کمرے اور برآمدے۔ بلندوبالا مینار اپنی عظمتوں کے ساتھ کھڑا تھا۔زمانوں کے تغیروتبدل کا بار سینے پر اٹھائے۔ پانچ وقت اذان کی پُرسحر آواز سے جب گھنٹیاں بجنے کے وقت کا سامنا کیا تو کیا کچھ محسوس ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا پہلے تو اِس سے باتیں کروں۔

اقبال کو یاد کروں۔اس کے شعر گنگناؤں۔

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت وسنگ چنگ ہو یا حرف وصَوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

نظروں کے والہانہ پن نے تالاب کو دیکھا۔ پھر درختوں پر آ کر رُکیں۔بسنتی رنگے مالٹے سبز پتوں میں سے لشکارے مارتے تھے۔آہنی جنگلے میں محصور زیتون کا پیڑ جو ابھی تک اپنی تاریخ کے ساتھ کھڑا تھا کہ عبدالرحمٰن اول کے ہاتھوں کا لگایا ہوا ہے۔ کہتے ہیں اندر سے تو کھوکھلا ہو گیا ہے مگر اوپر سے بڑا ترو تازہ تھا۔

عبدالرحمٰن اول کو درختوں اور پودوں سے عشق تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ملکوں ملکوں گھوم پھر کر اس کے کارندے انواع واقسام کے پھول پودے اکٹھے کرتے۔ قرطبہ کو انہوں نے اِن رنگارنگ پھولوں کی خوشبو سے مہکا دیا تھا۔ ان کے رنگوں سے سجا دیا تھا۔

بائیں ہاتھ والے برآمدے کے عین وسط میں ٹکٹ گھر تھا۔ چلیئے آٹھ یورو کا ٹکٹ ہوا۔ لائن میں لگنے سے پہلے ہم نے برآمدوں کا ایک چکر کاٹا۔ مرکزی دروازے والی سمت کے اِن کمروں میں کبھی درس وتدریس ہوتی تھی۔ اُن روشن فکر، اعلیٰ دماغ اور فطین ہستیوں کی تربیت کے مراحل یہاں طے ہوتے تھے۔

رُک گئی تھی۔ صحن کی بنّی پر بیٹھ گئی اور سوچا کہ پہلے تو چند لمحوں کے لئیے ایک بار پھر امویوں کے اُس شہزادے عبدالرحمٰن بن معاویہ کو خراج تحسین پیش کروں کہ جب ایک مسلمان حکمران کا وزیر اعلیٰ ایک یہودی اور کیتھولک آرچ بشپ اس کا وزیر خارجہ تھے۔ میرٹ اور مذہبی رواداری کی بے حد روشن مثال۔ اس کے عہد سے بعد کی آنے والی نسلوں نے اُندلس کو علم وفن کی جن بلندیوں پر پہنچایا اُس کا اعتراف تاریخ نے خود کیا۔

طب کی دنیا کا وہ بڑا نام ابوالقاسم الزہراوی جس نے ''کتاب التصرف'' لکھی۔ طبّی سائنس کا یہ وہ نایاب تحفہ تھا جس سے یورپ کے سائنس دان صدیوں تک فیض یاب ہوتے رہے۔ امام قرطبی ابن رُشد اور عباس بن فرناس فن موسیقی کا وہ نایاب گوہر زریاب اسحاق موصلی کا شاگرد اور اِن جیسے بے شمار اور صاحبِ علم وفن کے لوگ جنھوں نے دنیا کو متاثر کیا۔ یورپ کی تحریک نشاۃ ثانیہ میں اپنا حصّہ ڈالا۔ فن کی دنیا کا کون سا شعبہ ایسا تھا جس میں تحقیق اور ایجادات نہ کیں۔ زمانہ معترف ہوا۔

دُکھ اور افسردگی کا دھیرے دھیرے وجود میں اُتر آنے اور اس مایوسی میں خود سے سوال جواب کرنے کا عمل بھی تو بڑا فطری سا تھا کہ جب صحن کے چبوترے کی بنّی پر بیٹھا بندہ

اِس سارے منظر کے ماضی اور حال میں سانس لے رہا ہو۔

وقت کے دھارے کا ایک طرف وہ کمال اور دوسری جانب تنزلی کا یہ عالم کہ یہ بیچاری مسلم امّہ بے حسی و بے غیرتی کے پاتال میں گری پڑی ہو۔ چہار جانب گھٹا ٹوپ اندھیرا مقدر بنا ہوا ہو اور کہیں روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی ہو۔

ہاں شاید وقت ہمیشہ عروج و زوال کے حصار میں قید ہوتا ہے۔ جیسے لازم و ملزوم ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ روشنی تو پھوٹے گی مگر کب؟ اس کا فیصلہ آسمانوں پر ہے۔

اٹھے اور قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اندر جاتے ہوئے قدموں میں ہلکی سی لرزش اور دل میں دھڑکنوں کا شور تھا۔ ہونٹوں پر اقبال آ گیا تھا۔

شوق مری لے میں ہے شوق میری نَے میں ہے
نغمہ اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

مگر ساتھ ہی میرے اندر نے پھٹکارا بھی تھا۔ ہائے کاش یہ نغمہ ''اللہ ہو'' تو اپنی رگ رگ میں اُتار لیتی تو کیا ہی بات تھی۔

وہ تصویر جو ہمیشہ مضطرب کرتی تھی آج مجسم صورت میں سامنے تھی مگر کِس انداز میں۔ سچ تو یہ تھا کہ جیسے دم بخود ہونے والی بات تھی۔ پلکیں گرنا بھول گئی تھیں اور آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیلی اپنے سامنے اِس حیرت کدہ کو دیکھتی تھیں جو جاہ و جلال کی منہ بولتی تصویر تھا۔

ستونوں کا ایک جنگل مگر کتنا خوبصورت اور کِس تناسب کے ساتھ کھڑا کہ کِسی بھی اگلے منظر کا راستہ نہیں روکتا تھا۔ محراب در محراب چلتا ہوا سلسلہ۔ رنگوں کی خوبصورتی اور امتزاج خواب ناک سی تاریکی کا فسوں ہر سو پھیلا ہوا تھا۔

کتابچے میں درج تھا کہ بیرونی مشرقی دیوار جس میں کوئی کھڑکی دروازہ نہیں تھا اس وقت۔کبھی یہاں محرابی دروازوں والے برآمدے تھے۔ایک جانب صحن کے دل کش نظارے تھے تو دوسری جانب دریا الکبیر کے۔کشادگی، وسعت، روشنی، ہوا اور فضا کی مہک سب دامن دل کو مسرت و شادمانی سے ہم کنار کرتے۔ایسے میں بھلا اقبال کیسے نہ یاد آتے۔آئے اور ساتھ میں اُن کے جذبات واحساسات کی شدت بھی اسی انداز میں شعروں کی صورت ہونٹوں پر تھرکنے لگی۔

تیرا جلال و جمال — مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل — تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار — تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور
تیرے منارِ بلند جلوہ گہہ جبرائیل

سیاہ آہنی ریلنگ سے گھرا منبر و محراب والا حصّہ گویا اس سارے منظر نامے کی جان ہے۔

رنگین نقاشی اور قرآنی آیات سے سجی دیواریں اور محرابیں جن کی تعمیری ساخت اِس درجہ ماہرانہ انداز میں ہوئی ہے اور کندہ کاری اور رنگ آمیزی کا وہ دلکش امتزاج نظر آتا ہے کہ بندہ گنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ان پر سایہ فگن گنبد اور اس گنبد کے مرکزی حصّے کی نقاشی جیسے ایک خوبصورت خوش رنگ پھول کی پنکھڑیاں اپنے بخت پر نازاں ہوں۔

کعبہ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبین
تجھ سے حرم مرتبت اُندلسیوں کی زمین

ہے تہہ گردوں اگر حُسن میں تیری نظیر

قلب مسلمان میں ہے اور نہیں ہے کہیں

تصور کی آنکھ وقت کی اُس ٹنل میں لے گئی جب عین اسی جگہ وہ لافانی شاعر سجدہ ریز ہوا تھا۔ اپنے عشق سے کہیں زیادہ اُنہیں اِسے تعمیر کرنے والوں کا عشق محسوس ہوا تھا۔ یہ عشق جو نہ عمارتوں میں تھا اور نہ خلافتوں میں۔ یہ عشق جو حاصل زندگی تھا۔ ان کے لیے جنہوں نے تخت پر بیٹھنے اور تاج سر پر سجانے کے باوجود اس کے پتھر اٹھانے اور اس کی مٹی کو آنکھوں کا سرمہ بنانے کو اپنے لیے سعادت جانا۔

یہ سعادت کِسی ایک نے نہیں بلکہ ہر ایک نے حاصل کی۔ عبدالرحمٰن اول سے عبدالرحمٰن سوئم تک درمیان میں بیٹے، پوتے بھی شامل ہوئے۔ ہر ایک نے اپنا اپنا حصّہ بقدر اپنے اپنے جذبوں کے ساتھ ڈالا۔

ہسپانیہ تو خون مسلمان کا امین ہے

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

پوشیدہ تیری خاک میں سجدوں کے نشان ہیں

خاموش اذانیں ہیں تیری باد سحر میں

دائیں دیکھا، بائیں دیکھا اور زمین پر سجدہ ریز ہوگئی۔ جیسے آنسوؤں کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ نہ زمین پر بکھری کِسی مٹی کا احساس، نہ اُس کے آنکھوں میں گُھسنے کا کوئی خوف۔ جب سر اٹھایا آنکھیں صاف کیں اردگرد دیکھا۔ میرے قریب کوئی نہیں تھا۔ کیمروں نے مجھے اپنی گرفت میں لیا۔ نہیں لیا۔ نہیں جانتی۔ بس میں اکیلی تھی۔ دور چھینی ناکوں والے جاپانیوں کا وہی ٹولہ نظر آتا تھا۔ جو تصویر کشی میں مصروف تھا۔

اذان کی آواز تو یہاں گونجی تھی۔ جب وہ عظیم شاعر یہاں آیا تھا۔ جس نے نماز

پڑھنے کے لیے خصوصی اجازت برطانیہ کی حکومت سے حاصل کی تھی۔جس کا جائے نماز صدیوں بعد محراب میں بچھا تھا۔جس کا سر سجدے میں گرا تھا تو یقیناً اشکوں کا طوفان اٹھا ہو گا۔

میری آنکھیں گویا ہوس کے پھندے میں پھنس گئی ہیں اور ہل من مزید پر اصرار کرتی اور کہتی ہیں کہ اللہ کے ننانوے نام تو دیکھ لو۔اُن کا دیدار کر لو۔

اور جب آنکھیں یہ سب چھوٹی بڑی جزئیات ایک ایک کر کے جذب کرنے میں مصروف تھیں۔پاگل دل پھر مچلنے لگا تھا۔اکسانے لگا تھا۔

ایسا ہی ایک گرمیء جذبات سے لبالب بھرا ہنگامہ 21 نومبر 1991 کی شام کو یہاں محراب میں سجا تھا۔ساڑھے سات سو سال بعد یہاں کوئی مسلم تقریب منعقد ہوئی تھی۔یورپ میں بسنے والے عاشقان اقبال نے پوری دنیا سے اقبال کے سچے عاشق اکٹھے کر لیے تھے۔اِس اقبال فاؤنڈیشن نے یہاں قرطبہ کانگرس سجالی تھی۔

آنے سے قبل ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب پڑھنے سے اس کی ساری تفصیلات سے آگاہ ہوئی تھی کہ وہ بھی اِس تقریب کے ایک مندوب تھے۔کانگریس کے منتظم اعلیٰ ڈاکٹر لامان جوفرانسیسی تھے اور اقبال کے سچے عاشقوں میں اپنا نام لکھتے تھے۔انہیں ویٹی کن سٹی جا کر پوپ پال سے اجازت حاصل کرنا پڑی کہ سپین کے بشپ نے انکار کر دیا تھا۔واہ مسجد قرطبہ کے سچے عاشق کی پذیرائی کِس خوبصورت انداز میں ہوئی۔

اب میرا دل کیسے نہ یہ چاہتا کہ غوطہ ماروں اور اس زنجیری حلقے کے نیچے سے نکل کر سیدھی محراب کی گود میں بیٹھ جاؤں اِس زمین پر ایک بار پھر سر رکھ دوں۔مگر اب اردگرد لوگ تھے۔چلو اُن کی تو خیر صلاّ کوئی یہی کہہ دیتا کہ کوئی پاگل عورت ہے۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا کوئی ہوتا تو گوہر افشانی کر دیتا۔انڈیا پاکستان کی

ہوگی۔ایسی جذباتیت اور پاگل پن کے دورے ان ملکوں کے مسلمانوں کو ہی پڑتے ہیں۔نری کھوکھلی محبتیں اور عمل صفر۔

چلو خیر ان کی مجھے کیا پرواہ تھی۔ڈر تو اُن نوجوان گارڈوں کا بھی نہیں تھا جو ذرا بھی خونخوار نظر نہیں آرہے تھے۔وطن میں پڑھی گئی چند تحریروں کی یادیں کچھ خوف زدہ سی کرنے والی ضرور تھیں۔مگر یہاں صورت بڑی معتدل سی محسوس ہوئی تھی۔تو کیا حرج تھا کہ جنگلے کے نیچے سے آگے چلی جاؤں۔

تاہم رُک گئی۔اگر کچھ گڑ بڑ ہوگئی تو پاکستان بدنام ہوگا نہیں ایسی کوئی جذباتی حرکت نہیں کرنی جس سے''پاکستانی ہے'' پر آنچ آئے۔چلو اب اس کا جو حسن سامنے ہے اس سے تو روح کو تر وتازہ کروں۔

داہنے ہاتھ وہ حصّہ تھا جو اس برآمدے میں کھلتا تھا جہاں سے خلیفہ اپنے محل سے سیدھا مسجد میں آجاتا تھا جو اب چرچ کا ٹریژری روم بنا ہوا ہے۔

فانوس جلتے تھے۔یقیناً یہ تب بھی جلتے تھے۔ہاں البتہ تب بجلی سے نہیں زیتون کے تیل سے اللہ کے اِس گھر کو منور کرتے تھے۔رمضان کے مہینے میں ایک مومی شمع جو وزن میں پچاس پونڈ کے لگ بھگ تھی۔دن رات جلتی تھی۔عود اور عنبر جلتا۔خوشبوئیں ہرسو پھیلی رہتیں۔

مسجد کو چرچ نے یرغمال بنا رکھا ہے۔چرچ کو بھی دیکھا۔شان وشوکت کا یہاں کچھ وہی عالم تھا کہ ساری برگزیدہ ہستیاں ہیرے جواہرات میں لپٹی نظر آتی تھیں۔آنکھ نہیں ٹکتی تھی اُس شاہانہ کرّ وفر پر۔ایسا ہونا تو فطری امر تھا کہ جب یورپ بھر کے نامور فنکار جذبوں سے لدے پھندے یہاں آئے اور سالوں تک اس میں فن کے موتی تارے ٹانکتے رہے۔پھر کہیں دوڈھائی صدیوں کی محنت شاقہ نے اِسے یہ روپ دیا۔مگر اِس نے ایک عظیم

فن پارے کو بھی نقصان پہنچایا۔

دراصل سقوط قرطبہ کے فوراً بعد ہی مسجد میں چھوٹے چھوٹے چیپلز Chapplas تو بننے شروع ہوگئے تھے۔سینٹ ز Saints کے ناموں سے بھی انہیں منسوب کردیا۔حد بندیاں بھی کردیں۔یہ تعمیرات زیادہ تر منصور والے تعمیری حصّے میں ہوئیں۔مگر باقاعدہ کھیتڈرل تو چارلس پنجم کے زمانے میں بنا۔تاہم یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کہیں بادشاہ کا گزر قرطبہ سے ہوا اور وہ مسجد دیکھنے چلا آیا۔یہ بھی روایت ہے کہ وہ چرچ کا افتتاح کرنے آیا تھا۔وہ تو سکتے کی سی کیفیت میں آگیا۔اس کے یہ الفاظ بھی تاریخ میں کہیں محفوظ ہیں۔

''تم نے ایک ایسا شاہکار تباہ کردیا جس کا بدل دُنیا میں ممکن نہیں۔کاش تم لوگ کچھ سوچ لیتے۔''

اگر عبدالرحمٰن اول، دوم، ال حاکم اور منصور نے اس کی تعمیر سے لے کر اس کی وسعت اور اسے خوب سے خوب تر بنانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔وہیں احساس ہوتا ہے کہ جیسے اِسے خوبصورت اور حسین سے حسین تر بنانے میں بھی پورا زور لگا دیا گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ میرا اضطراب مجھے ٹکنے نہیں دے رہا تھا۔میں سیما سے الگ ہوگئی کہ چلو اِس شتر بے مہار آرزو کی تکمیل کا کوئی سامان کروں۔بسا کہ آرزو خاک شد۔بہتیرا کونے کھدرے کی تلاشی لی مگر کوئی جگہ ایسی نہ نظر آئی۔دل کو پھٹکارہ۔جو مل گیا اُسے غنیمت جان۔مزید کی طلب میں بے حال نہ ہو۔۔پھر بینچ پر بیٹھ کر دعائیں پڑھیں اور دعائیں مانگیں۔اور اقبال کا یہ شعر پڑھتے اٹھی۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمین، آسمان
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذان

اُن خوبصورت چہروں اور خوبصورت آواز والیوں کو یاد کیا جوفن کی دنیا میں طاہرہ سیّداور ملکہ پکھراج کے نام سے جانی جاتی ہیں اور جنہوں نے اقبال کے عشق ،اُن کے درد کو اپنا سوز دے دیا۔

اقبال کی دنیا سے باہر نکلی۔اور سیما کو ڈھونڈا۔سیما دوسری جانب مسجد کا میوزیم دیکھ رہی تھی۔

اب مہر النساء کی تلاش ہوئی۔اندر تو کہیں نظر نہ پڑی۔

سوچا باہر ہوگی۔ باہر آئے۔ پورے صحن میں دیکھا۔ برآمدوں میں نظریں دوڑائیں۔وہ تو کہیں نہیں تھی۔دراصل ہم تینوں پاکستانی اپنے ڈوپٹوں اورشلواروں سے دور سے ہی بڑی نمایاں نظر آتی تھیں۔وہ کہاں چلی گئی۔سیکورٹی گارڈز کی منت سماجت سے دوبارہ اندر گئی۔اب پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے یہاں وہاں لوگوں کو ،جگہوں کو، کونے کھدروں کو دیکھتی پھر رہی ہوں۔مگر وہ کہیں ہوتی تو ملتی۔

ایک چکر مرکزی دروازے سے باہر گلی کا لگایا۔دوسرا عقبی گلی کا۔دُکانوں میں بھی جھانکا۔عجیب بات تھی۔ہم لوگوں نے تھوڑی کنجوسی بھی کی تھی ۔لوکل سم نہیں ڈلوائی۔وائی فائی سے کام چل رہا تھا۔

میری پریشانی اور بدحواسیوں پر سیما نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تھا۔

’’فضول میں ہلکان ہورہی ہو۔وہ ہوٹل چلی گئی ہوگی۔‘‘

’’کمال ہے۔سیما کیسے گئی ہوگی وہ۔‘‘

’’کیوں ٹیکسیوں کا کال پڑ گیا ہے یہاں۔اس کی جیب میں یورو نہیں ہیں کیا؟ کوئی دودھ پیتی بچی ہے جس نے تمہاری انگلی پکڑ کر چلنا ہے۔زمانہ کھا کھٹ بیٹھی ہے۔

سیما مُصر تھی اور میں یقین کرنے سے منکر تھی۔سیما کی میرے اوپر لتاڑ بھی ساتھ

ساتھ جاری تھی کہ آخر ایسی مخبوط الحواس کے ساتھ تم چلتی کیسے ہو؟

سچی بات ہے واقعی اس کے ساتھ چلنا بہت مشکل تھا۔عجیب عادتوں کی مالک تھی۔مگر میری بھی تو مجبوری تھی کہ اس کا ساتھ مجھے میسر تھا۔جب اور جس وقت کہتی بھئی فلاں ملک چلنا ہے۔کہو پروگرام بنالوں۔وہ حاضر جناب کا نعرہ لگاتی اور چور نالوں پنڈ کالی کے مصداق میرا ناک میں دم کر دیتی کہ اب چلو۔

یوں یہ اور بات تھی کہ وہ اپنی بونگیوں اور ہٹ دھرمی سے میرے لیئے سفر میں پریشانی اور اذیت کا سبب بھی بنتی تھی۔ماسکو سے پیٹرز برگ جاتے ہوئے اس نے جو ڈرامہ کیا اور جیسے مجھے اجنبی دیس کے پلیٹ فارم پر رُلایا وہ ناقابل فراموش تھا۔سیما یہ سب مجھ سے سن چکی تھی۔اور اُسے صلواتیں سنانے کے ساتھ ساتھ میری بھی کلاس لے رہی تھی۔

''اُف گیارہ بج رہے ہیں۔آج کا سارا پروگرام غارت ہوتا نظر آرہا ہے۔میں جھنجھلائی ہوئی اِدھر اُدھر تانکا جھانکی سے باز نہیں آرہی تھی۔ہائے کہیں نظر آجائے،ہائے کہیں آسمان سے گر پڑے،زمین اُگل دے۔اللہ کتنا کچھ دیکھنا تھا آج۔''

اب ٹیکسی لینے اور ہوٹل جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ہوٹل کے اندر داخل ہونے اور کاؤنٹر پر موجود لڑکوں سے یہ سوال کرنے کہ ہماری ساتھی کمرے کی چابی تو نہیں لے گئی۔پوچھنے تک میری جان جیسے سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔دفعتاً ذرا سا رخ بدلنے پر سامنے لاؤنج پر نظر پڑی۔اور میں جیسے ہکا بکّا سی وہیں چند لمحوں کے لیئے ساکت ہوگئی تھی۔منحوس ماری صوفے پر لیٹی موبائل کانوں سے لگائے کس مزے سے باتیں کر رہی تھی۔

اف جی چاہا لتّر اُتاروں اور مار مار کر حشر کر دوں۔اس کا بھی اور اپنا بھی کہ میں جو اتنی کم عقل اور احمق ہوں کہ چیزوں کو سمجھتی ہی نہیں۔

میں نے کیا بکواس کی تھی۔سیما نے مجھے یوں گھورا جیسے کہتی ہو تم بھی بڑی بونگی

ہو۔ واقعی میں ایسی ہی ہوں۔

اب ہم دونوں اس کے سامنے صوفوں پر بیٹھی اُسے دیکھتی اور اپنا خون کھولاتی تھیں اور وہ تھی کہ جیسے ہمیں جلانے، تڑپانے اور زچ کرنے پر تُلی بیٹھی بے نیازی سے فون پر پاکستان کسی سے باتوں میں مگن تھی۔ مجھے واش روم جانے کی حاجت تھی اور جب آئی تو دیکھا کہ وہ لال پیلی میرے اوپر برس رہی ہے۔

''ہاں اس نے میرے ساتھ ماسکو میں ایسے ہی کیا۔ یہ مجھے ہمیشہ ذلیل کرتی ہے۔''

میرے لئیے سب سے زیادہ تعجب انگیز رویہ سیما کا تھا جو بیٹھی نہ صرف اُسے سُنتی تھی بلکہ چہرے کے تاثرات سے اُس کی ہمنوائی کرتی بھی محسوس ہوئی تھی۔

سچی بات ہے میرا تو وہ حال تھا جیسے تلووں لگی اور سر پر چھوٹی۔ پہلے تو سیما پر برسی یہ تو کیا منافقوں اور پھاپھا کُٹنیوں والے کام کررہی ہے۔ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے اسے لیر لیر کر رہی تھی۔ اب حق سچ کی بات کہنے کی بجائے منہ میں گُنگنھیاں ڈال لی ہیں۔ پوچھ تو سہی اس سے کہ یہ وہاں سے آئی کیوں؟

آوازیں اونچی ہوئیں تو سوچا کہ دنگل کمرے میں چل کر لگاتے ہیں۔ یہاں غیر ملکیوں کو بغیر ٹکٹ کے تماشہ نہ دکھائیں۔

کمرے میں آ کر میں نے جی بھر کر مہرالنساء کو سنائیں اور ساتھ سیما کی بھی تواضح کی۔ بول بول کر ہم سب ہپو ہان ہوگئیں۔ سیما نے تو خیر فوراً پینترا بدل لیا تھا۔

اب مردوں کی طرح تینوں اپنے اپنے بیڈ پر لیٹ گئیں۔

تھوڑا غصہ اُترا تو سوچا کہ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا کہ بھاڑ میں جاؤ تم لوگ۔ اپنا اپنا سیر سپاٹا کرو۔ چاہے ہوٹل کی منجیاں توڑو، چاہے قرطبہ کی گلیاں ناپو۔ سب عاقل بالغ زمانہ

ہنڈایا ہوا۔کوئی میری محتاج نہیں اور نہ میں کسی کی۔

پر اب یہ کتنی کمینگی والی بات ہو گی۔ میری تو موجیں ہوں گی۔مگر سیما جو بیساکھیوں کے ساتھ چلتی ہے۔اور دوسری والی بھی ایسی ہی ہے۔تو ان کی سیر کھوٹی ہو گئی نا۔چل بڑا حوصلہ کر۔اپنی میں کو مار۔‘‘

کچھ ڈھیل سیما نے دکھائی کچھ میں نے اور اس بیوقوف کو اٹھایا اور تین گھنٹے کے ضیاع کے بعد دوبارہ قدیمی حصّے میں پہنچے۔

☆☆☆

باب نمبر: 11 قدیم قرطبہ

- پلازہ ابنِ میمون کو دیکھنا بھی ایک انوکھا اور خوبصورت تجربہ تھا۔
- سیکولر روایات کے بانی ابن رُشد کی سوچ وفکر سے مسلمانوں کی نسبت یورپ زیادہ متاثر ہوا۔
- مدینۃ الزہرہ ماضی کے عظیم الشان خلیفاؤں کی مورش تہذیب کا ورسیلز ہے۔

جنوبی سپین کا یہ قرطبہ جو کبھی ماضی کی یادگاروں اور یادوں کے سائے میں سانس لیتا ہے۔کبھی حال کے ملاپ میں دن گزارتا اور کبھی اِن دونوں کے دلکش ملاپ کی تصویر پیش کرتا نظر آتا ہے۔یہی ہے وہ شہر نگاراں جہاں قدامت کا حسن اور جدیدیت کے رنگ گلے ملتے ہیں۔

تو اگر کہیں اس کے ہونے کے چکر میں پڑیں تو معلوم ہوتا ہے۔قبل مسیح سے بھی سینکڑوں سال پہلے یہ شمالی افریقہ کے کارتھاگنیئن Carthaginian لوگوں کا شہر تھا۔یہ اب اللہ جانے کہ اُن پر کوئی اُفتاد پڑی کہ اپنے بستے رستے گھروں سے نکلے یا پھر جیالے تھے۔خون میں گرمی تھی۔نئی زمینوں پر جھنڈے گاڑنا پسند تھا۔

اب رومنوں کو ہڑک اٹھی۔ یہ تو کمبخت مارے تھے ہی ماردھاڑ اور خون خرابے والے لوگ۔زمانہ تھا کوئی 206 قبل مسیح کا۔انہوں نے خوبصورت عمارتوں اور مظبوط قلعوں سے اسے سجادیا۔

اوپر بیٹھا اللہ میاں بھی اِن رومنوں کے تکبّر ونخوت اور ظلم وستم سے اُکتا گیا تھا شاید۔سوچا ہوگا کہ یہ نانہجار تو زیادہ ہی سر چڑھ گئے ہیں۔تو بس کوئی پانچویں، چھٹی صدی میں یہ گوتھوں Visigoths کے قدموں میں آن پڑا اور آٹھویں صدی میں مور مسلمان اس پر چڑھ دوڑے۔

اب اس کی تاریخ تو مالا مال ہے۔کتنی قوموں، کتنی ثقافتوں اور کتنی تہذیبوں کا نمائندہ رہا یہ۔چہرے پر کہیں رومنوں کے نقوش بکھرے ہیں، کہیں گوتھوں کے اور کہیں موروں کے۔اِن سبھوں نے جو جو کچھ اس شہر کو دان کیا اُس نے اسے ایک منفرد رعنائی دی۔دسویں صدی میں یورپ کو بھی بتایا کہ خواہ روم ہو، پیرس ہو یا لندن اس کے پلّے کا دنیا میں ایک بھی شہر نہیں۔یہ اپنے علم کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب وثقافت اور مذہبی رواداری میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔

تو یہ شہر جسے ورلڈ ہر یٹیج نے اپنے کلیجے سے لگا لیا ہے۔اس کے چہرے، اس کے جسم پر جو جو زخم اور دھبے اُسے نظر آئے۔اُن کی مرہم پٹی اور پھر میک اپ سے اس کا سنگار کیا کچھ اس انداز میں کہ بندہ تو کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔واہ کیا رعنائی وزیبائی ہے۔

سچی بات ہے دنیا میں شاذ ہی کچھ ایسی جگہیں ہونگی جو خود کو ہسپانیہ کے پلّے کا ثابت کرسکیں جہاں سوچ وفہم کے دیئے روشن ہوئے، جہاں علم کے چراغ جلے، جہاں فنون لطیفہ کے علوم نے قلب وروح کو منور کیا۔اِس شہر کو عظمت کا تاج پہنانے والے مسلمان حکمرانوں پر سلام جنہوں نے شہر میں جابجا لائبریریاں کھولیں۔میڈیکل سکول بنائے، یونیورسٹیاں قائم کیں۔جنہوں نے اِسے علم کا شہر بنایا۔

ان ہستیوں پر بھی سلام جو صاحب علم وتصوف تھیں۔ڈھیروں سلام اُس ابن رُشد (Averroes) پر، ہزاروں گل ہائے محبت اُس ابن میمون Maimonides اور

اُن جیسے سینکڑوں کیا ہزاروں پر جنہوں نے اِس دھرتی پر جنم لے کر اسے معتبر کیا۔

یہ حصّہ جسے ٹیکسی ڈرائیور نے جیوڈیرا (Juderia) یعنی پرانا جیوش کواٹر کہا ہے جو مسجد کے قریب ہی ہے۔ اس راستے سے ٹیکسی ایک بلند و بالا گیٹ سے اندر داخل ہوئی یہ Almo Novar Gate کہلاتا تھا۔

قرطبہ بھی پرانے زمانے کی ریت کے مطابق فصیلوں میں مقید تھا۔ بڑے بڑے محرابی دروازے اس کی شناخت تھے۔ قرطبہ میں بھی سات دروازے تھے۔ چند ایک ابھی بھی ہیں۔ کچھ بڑی اور خوبصورت عمارتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے ہمیں ایک میدان میں اتار دیا۔

قرطبہ کا یہ قدیمی حصّہ جو غلام گردشوں، سفیدی میں نہائے صحنوں اور تنگ تنگ گلیوں پر مشتمل ہے۔ جو قرونِ وسطیٰ کے تعمیراتی حسن سے سجا ہوا سیاحوں کو مسرور کرتا ہے۔

گھروں کو سفیدی کا حسن دینا قرطبہ کی اسلامی دور کی روایت ہے۔ اہل قرطبہ نے اِسے زندہ رکھا ہے۔ سفیدی میں نہاتا شہر سفید گلاب جیسا ہی نظر آتا ہے۔

ان گھروں کی اندرونی چھوڑ بیرونی دیواریں بھی کہیں بیلوں، کہیں گل دانوں اور کہیں گملوں میں مہکتے پھولوں کی صورت سجی آنکھوں کو تازگی اور مسرت دیتی تھیں۔ بالکونیاں بھی ایسے ہی منظروں سے بھری تھیں۔ اس کی خوبصورت شاندار دُکانیں بھی پھولوں سے، پودوں سے، بیلوں سے سجی ڈھنپی آپ کی روح تک کو تازہ کرتی تھیں۔ بہت تنگ گلیاں جن کے دریچوں اور سفید دیواروں کو جیسے فطرت اپنے حسن کی بارش سے نہلاتی ہو۔

یونہی پھرتے پھراتے گھومتے ہوئے ایک ایسی تنگ گلی میں جا نکلے جس کے منہ ماتھے اور جسم پر خستگی اور کہنگی تھی مگر کس درجہ حسین کہ اس کی ایک ایک تفصیل حیرت کے جہان کھولتی تھی۔ دروازوں کے آگے رنگا رنگ پھول اور دیواروں پر پھیلی سبز بیلیں۔ پتھروں

والی دیواریں اوراُن میں بنی بالکونیاں۔پتھروں کی گلیاں کتنی دیر ہم وہاں کھڑے رہے۔

منظر کلاسیکل تھے۔آپ کو ماضی کی اساطیری دنیا میں لے جاتے تھے۔بمشکل تین آدمیوں کے ساتھ ساتھ پھنس کر چلنے جیسی وسعت والی گلیاں، دائیں بائیں مڑتی نئے منظر کھولتی اور نیا جہان وا کرتی تھیں۔تین منزلہ، دومنزلہ عمارتوں کے نچلے حصّوں میں دکانیں جن میں سیاحوں کے پُرے گھسے کہیں خریداری کرتے اور کہیں اس کے نظاروں سے لطف اٹھاتے تھے۔

پھر جیسے دردل کشائی جیسا ایک منظر سامنے تھا۔قدامت کے حُسن سے لبریز منظر۔بگّھی میں جُتا گھوڑا اپنی لمبی گردن بڑھائے خستہ حال سے فوّارے کے پانیوں میں منہ دیئے گھٹ گھٹ پانی پی رہا تھا۔تالاب کے اوپر بنے فینسی سے بڑے حجم والے مرتبان نما برتن میں جمع پانی میں لگے پائپ سے ایک آدمی منہ لگائے پانی پینے میں جتا ہوا تھا۔انسان اور حیوان ایک ہی گھاٹ پر پیاس بجھاتے ہوئے ایک پر لطف سی کہانی کی یاد دلاتے تھے۔بڑی بڑی سیمنٹ کی صلیبوں والا یہ صحن اچانک ہی ایک تنگ سی گلی کے خاتمے پر ہمارے سامنے ظاہر ہوا تھا۔ہماری آنکھیں مانوسیت کے احساس سے جگمگا اٹھی تھیں۔

اب وہ دونوں دکانوں میں گُھسنا چاہتی تھیں۔اُن کی کوششوں کو ناکام بناتے ہوئے میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''پہلے ذرا گھوم پھر کر دیکھ لیں۔پھر خریداریوں کے چکر میں پڑنا۔''

چلو شکر دونوں نے بات سُن لی۔

ایک گلی آگے بڑھ کر ہمیں ایک چھوٹے سے کشادہ میدان میں لے گئی۔جہاں چمکتی دھوپ تھی۔موتی برساتا فوارہ اس کا حسن بڑھاتا تھا۔تنگ سی گلی مسجد کے اکلوتے مینار کو بھی دلکش انداز میں پیش کرتی تھی جس کی بلندی پر لٹکی گھنٹی بھی نظر آتی تھی۔

انہی گلیوں میں پھرتے پھراتے پلازہ ابن میمون کو دیکھنا بھی ایک انوکھا اور خوبصورت تجربہ تھا۔ یہ جیوش کواٹر کے عین وسط میں ہے۔ موسیٰ ابن میمون، صلاح الدین ایوبی کا معالج، اپنے وقت کا عالم ہی نہیں، فلکیات کا ماہر اور قابل فزیشن بھی تھا۔ اسی قرطبہ میں ہی پیدا ہوا۔ اس سکوائر کا نام اس کے نام پر اور یہاں چبوترے پر کتاب ہاتھ میں پکڑے بیٹھا ہے۔

چہرے پر علم کی فضیلت کا پرتو جگمگاتا ہے۔ مجسمہ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے روکتا اور تصویر بنانے کو کہتا ہے۔ آپ اس عظیم شخصیت کے قدموں میں اپنے ہاتھ رکھتے اور چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں کہ مجسمہ ساز نے آنکھوں میں وہ علم، تدبر اور علم کے نور کی روشنی پیدا کرنے کی اپنی سی کوشش کی ہے جو اِس ذات سے وابستہ تھی۔

پتھر کے پیڈسٹل سے اپنے وجود کو چمٹاتے، کہیں ماحول کے حُسن اور کہیں ماضی کی ٹنل میں گُھستے ہوئے اس کی ذات کے اُن سب گوشوں کو کھولتے ہیں جن میں اس کے علم، مشاہدے اور تجربے نے دنیا کو عظیم الشان ورثہ دیا۔ اس کے نام کی پلیٹ آپ کو دیکھنے اور پڑھنے کے لئیے کہتی ہے۔ پڑھنا ناممکن ہے کہ آپ کا علم محدود ہے۔ دیکھنا کافی ہے۔ مجسمے سے آگے محرابی راستہ سرسبز بیلوں سے آراستہ آپ کو آگے بڑھنے اور اندر جانے کے لئیے اُکساتا ہے۔

خوبصورت کمروں میں اس سے متعلق بہت سی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کمرے میں اس کے جوتے، ٹوپی صدری اس نوع کی چند اور چیزیں توجہ کھینچتی ہیں۔ صدری ٹائپ واسکٹ کیا اس دور کی ہے؟ ابہام سا ہے۔ کمروں میں فریم شدہ خوبصورت حاشیے والی تصویریں آویزاں ہیں۔ رسم الخط عبرانی زبان کی ترجمانی کرتا تھا۔ انگریزی میں لکھا ہوا باریک بھی ہے اور فاصلے پر بھی کہ پڑھنا مشکل۔

شوکیسوں میں بھی مسودات دھرے ہیں۔آنگن کا فرش چھوٹے گول پتھروں سے ڈیزائن دار ہے۔دل کش لگتا ہے۔ایک جگہ سیاہ خونخوار بل فائٹر کھڑا ہے۔باغ کی سجاوٹ متاثر کن ہے۔سرو کے بوٹوں کی قطاریں بہت جانفشانی اور محنت سے تراشی گئی ہیں۔سیڑھیوں کی دیواروں پرآویزاں گملوں میں پھول ہنستے ہیں۔

ویانا محل اوراس کے باغ کو دیکھنے کا بھی ایک اپنا لُطف تھا۔فواروں میں موتی اڑ رہے تھے۔گول چھوٹے پتھروں سے بنے نفیس محرابی راستے کھجور کے درخت بوگن ویلیا کی بیلوں کا پھیلاؤ چنبیلی کے پھولوں کی خوشبوئیں اور مالٹوں سے بھرے درختوں کا حسن سب موہ لینے والے منظر تھے۔

ابوقاسم اس وقت کے نامور سرجن کا گھر دیکھا۔وہ بھی وہیں قریبی گلی میں تھا۔

ان دلکش گلیوں کی سامان سے آپھری دکانیں جیسے اوباش لونڈوں کی طرح اشارے بازیاں کرتی تھیں۔اور بوڑھی اُدھیڑ عمر عورتیں بھی نوخیز لڑکیوں کی مانند مچلی جاتی تھیں کہ ہم نے تو انہیں جھپیاں ڈالنی ہی ڈالنی ہیں۔وہ میری ساتھی بھی ایسی ہی لفنگیاں تھیں۔تو میں دونوں کو وہیں چھوڑ کر اور مسجد کے عقبی چبوترے پر بیٹھنے کا کہتے ہوئے ادھر ادھر ہوگئی۔کہ مسجد ہر سمت سے مرکز میں تھی۔

میں پتھریلی ڈھلانی سڑک پر چلنے لگی تھی۔دفعتاً میری نظروں کی زد میں بڑی شاندار سی حویلی نما عمارتیں آئیں۔رُک کر میں نے مسجد کو دیکھا۔ سمت کا تعین لگایا۔اندازوں کے گھوڑے دوڑائے۔پھراُن کے ناموں کو یاد کیا مجھے گمان نہیں یقین ہوا کہ جہاں میں کھڑی ہوں۔اُن کے سامنے کی یہی دوعمارتیں ہیں۔ذہن میں بینڈ ولورا رہ گیا تھا۔دوسرا بھول گئی تھی۔

انہی میں سے ایک کی پیشانی پر چار دن تک اقبال ان کارڈوبا کا بینر لہرایا تھا۔یہی

وہ جگہیں ہیں جہاں میرے ملک اور دنیا بھر سے اقبال شناس جمع ہوئے تھے۔اب قرطبہ کے جدید حصّے میں ایک گلی Poeta Mohammad Iqbal کے نام سے وابستہ کر دینے کا کمال بھی تو اہل قرطبہ کا ہی ہے۔

میں نے محبت سے اُنہیں دیکھا۔اور کچھ دیر چاہت سے ان کا تفصیلی جائزہ لیا۔

بینڈ ولورا کے تو اندر بھی گئی۔روکا تھا۔مگر کہا ذرا دیکھنا ہے۔بہر حال اجازت مل گئی۔بڑا تاریخی سا ماحول تھا۔پھول پتے تو تھے ہی تھے۔پرانی بندوقیں بھی سجی ہوئی تھیں۔ اب گلیوں میں پھر رہی ہوں۔قرطبہ قدیم کی ڈیوڑھیوں کے کھلے دروازے سچی بات ہے دعوت دیتے تھے کہ آؤ اور ہمیں دیکھو۔

اس سیر سپاٹے میں پاتیو Patios سے بھی لطف اٹھایا۔اسے ہسپانوی زبان میں کشادہ صحن سمجھ لیں۔کاروباری زبان میں شاپنگ پلازہ کہہ لیں۔اس کے ساتھ اس کے لازمی جز زوکو zoco بھی Patio سے جوڑیں کہ یہ ایک دوسرے کا اٹوٹ انگ ہیں۔ رنگارنگ پھولوں کے زیورات سے سجے یہ آپ کو ایک ایسی مسرت سے سرشار کرتے ہیں کہ جس کا اظہار لفظوں میں ممکن ہی نہیں۔

کتابچوں کے مطالعے سے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ مئی کے آغاز میں پاتیو کا میلہ Patios Festival ہوتا ہے۔اِس میلے میں اِن گھروں کے مالک اپنے پاتیوز کی آرائش حد درجہ ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔انہیں پھولوں سے لدی پھندی دُلہن کی طرح سنوارتے ہیں۔مزے کی بات ہے کہ انتظامیہ انہیں اِس پر انعام بھی دیتی ہے۔

زمانہ قدیم میں تو یہ بڑے لوگوں کے گھر تھے۔اور زوکو ان کے صحن تھے۔دمشق ،حلب اور قرطبہ میں یہی طرز تعمیر رائج تھا۔مگر آج یہ شاپنگ سینٹرز اور طعمام گاہیں بنی ہوئی ہیں۔کہیں متوسط اور نچلے متوسط گھرانوں نے کچھ حصّہ اپنی رہائش گاہ کا بھی ساتھ رکھا ہوا

ہے۔

کیا گلیاں تھیں یہ۔ کیا حسن تھا ان میں۔ چھوٹے سے چھوٹے مکان کا بھی صحن تھا اور وہ پھولوں، پودوں سے سجا ہوا تھا۔ کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں اکثر برآمدوں میں اور کہیں آنگن میں بھی کھلتی تھیں۔ کہیں کہیں صحنوں میں موڑھے رکھے بھی نظر آئے۔

دروازے چوبی اور سلاخوں والے ہیں۔ اکثر گھروں کے Grilled دروازے سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتے تھے۔ کہیں پرانے وقتوں کے چرخی والے کنویں نظر آئے۔ کہیں بیچ میں فوارہ جس کی منڈیر گملوں، پودوں سے بھری نظر آتی تھی۔

ہائے کیسا جی چاہتا تھا۔ بیٹھ جائیں یہاں موڑھوں پر اور آنکھیں بند کر لیں۔ اُس وقت میں چلے جائیں جب اِن گھروں کے مکین اپنی روایتوں کے ساتھ زندہ تھے۔ اب بھلا الطاف حسین حالی کی نظم کیوں نہ یاد آتی۔ آئی اور بڑی شدت سے آئی۔

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے

یہیں کے ایک پاتیو میں ہم نے اپنی بھوک کا روزہ ویجی ٹیبل پیزا سے کھولا۔ نت نئے کھانوں کو للچانے کی حد تک ہی دیکھا۔ دہن آزمائی نہیں کی۔

ویزی گوتھ (Visigoth) والوں کا قلعہ بھی قریب ہی تھا۔

یہ قرطبہ کی ہمیشہ سے بڑی اہم جگہ رہی ہے۔ کبھی رومن بادشاہوں کی رہائش گاہ۔ جب مسلمانوں نے ہسپانیہ فتح کیا تو یہ مورش حکمرانوں کے تصرف میں بھی رہا۔ ہسپانیہ کے کھیتولک بادشاہوں نے بھی اسے توجہ دی جب وہ قرطبہ کے حکمران تھے۔ تو یہ ال کازر AL-CAZR بھی تو عین وہیں مسجد کے ہمسائے میں ہی تھا۔ دو گلیاں ٹاپو اور اس کے کھلے

میدان میں پہنچ جاؤ۔

بڑی دیو ہیکل قسم کی دیواریں تھیں، برج تھے جو صورت میں کہیں ہشت پہلو اور کہیں اسطوانی تھے۔ گوتھک سٹائل کا اظہار ملتا تھا۔ باہر سے اگر قلعے کا گمان گزرتا تھا تو اندر بھی قلعوں جیسا ہی تھا۔ ٹکٹ کے سلسلے، لوگوں کی لمبی لائنیں اور سکریننگ کے مرحلے۔ سیما اندر جانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں درخت کی چھاؤں میں بیٹھی سوچتی تھی کہ دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں۔

اور جب اس کے تاریخی مرحلوں سے گزرتی تھی کہ تعمیر تو کہیں 1328 میں شروع ہوگئی تھی۔ رومنوں اور مسلمانوں دونوں نے اسے فوجی مقاصد کے تحت استعمال کیا۔ باغ باغیچے تو بعد میں کہیں بنے۔

ٹکٹ تو مہر النساء لینے گئی تھی۔ لے بھی آئی۔ اور اندر داخلہ بھی ہو گیا۔ الفانسو دہم سے سرسری سا تعارف لفظوں کے ساتھ تو ہوا تھا۔ اب یہاں پورے قد بت کے ساتھ شناسائی ہوئی۔ جس ہال میں داخلہ ہوا۔ بڑا عالیشان اور وسعت والا تھا۔ بھئی آخر کیوں نہ ہوتا۔ ایک تو حد درجہ تاریخی تھا کہ کیتھولک بادشاہوں کا دربار یہیں لگتا تھا۔ ازابیلا اور فرڈی نینڈ یہیں بیٹھا کرتے تھے۔ باغات کا حُسن موہ لینے والا، فوارے، تالاب، روشیں، درختوں کی قطاریں اور ان کا حُسن سب لاجواب اور موہ لینے والے۔ بندے کا جی چاہتا یہیں بیٹھا انہیں ہی تکتا رہے۔

موزیک روم کا اپنا حسن تھا اور Sarco Phagus کا اپنا۔ پتھروں کے رومن تابوتوں اور کتبوں کی فنّی باریکیاں حیران کرنے والی تھیں۔ القصر غیر معمولی قسم کے تعمیراتی شاہکاروں کا نمونہ تھا۔ حمام بھی دیکھنے والے تھے۔ اندر جاتے ہی احساس تو ہو گیا تھا کہ بڑی انوکھی چیز ہے۔ اسکی تعمیر الفانسو XI نے کروائی تھی۔ تبدیلیوں پر تو وہی اصول چلتا

ہے کہ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت کے مصداق اس میں ردّو بدل کرنا اور اسے اپنے مزاج کے مطابق بنانا تو لازم ہوتا ہے نا۔

1931 میں اِسے ثقافتی ورثہ کہتے ہوئے ورلڈ ہیریٹج نے لے لیا۔ مجھے تو اِن ورلڈ ہیریٹج والوں کی سمجھ نہیں آئی۔ کہ یہ آخر یورپ والوں کی ہی چیزیں کیوں گود لیتے ہیں۔ ہم غریبوں پر نظر کرم کیوں نہیں کرتے؟ ہمارا قلعہ اور شیش محل کوئی کم خوبصورت اور تاریخی وثقافتی حوالوں سے کم تر شے تو نہیں تھیں۔ ایک ہمارے حکمران کھوٹے سکے، اپنی محل باڑیوں کے لیئے مضطرب و بے چین۔ قومی اہمیت کی اہم چیزوں کے تو بندے کانٹے سب اُتار کر اپنا دامن بھر لیں۔ ہمیں بھی کیسے لعنتیئے ٹکڑے ہیں۔ یقیناً ہمارے گناہوں کی سزا ہی ہے نا۔ تو ان سے کیا توقع۔

القصر کے باغات کے ساتھ ساتھ چلتی اُس تاریخی فصیل شہر کو دیکھنا بھی بہت مزے کا کام تھا۔ شکستہ خوردہ ضرور تھی پر کیا چیز تھی۔ دو میٹر موٹائی اور چھ میٹر اونچائی والی۔ جا بجا تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بنے محرابی دروازوں جن کے سامنے بلند پیڈسٹلوں پر قرطبہ کیا دنیا کی تاریخ متاثر کرنے والے مسلمان فلاسفر ابی سینا، ابن رشد، ابن الہیثم کہیں کھڑے کہیں بیٹھے نظر آتے تھے۔

سرنگوں تھا عظمت کے اِن پیکروں کے آگے۔ دل خراج تحسین پیش کرتا تھا۔ ابن رُشد جیسے عظیم فلسفی جسے یورپ ایویروس (Averroes) کہتی ہے۔ اِس عظیم ہستی کی سوچ وفکر اور نظریات سے جس طرح یورپ متاثر ہوا۔ مسلمانوں کی تاریخ اس سے بہت حد تک محروم نظر آتی ہے۔ ابن رُشد عظیم یونانی فلاسفر ارسطو سے نہ صرف متاثر تھا بلکہ اس نے اسلامی فکر و نظر اور سوچ کو ارسطو کے خیالات سے ملا کر کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی۔

ارسطو کو یورپ میں متعارف کروانے کا اعزاز بھی ابنِ رُشد کے کھاتے میں جاتا

ہے۔تھوڑی سی تفصیل،تھوڑا سا پس منظر بھی گوش گزار ہو جائے۔

دراصل مراکش کا خلیفہ یوسف یعقوب فلسفہ پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔وہ ارسطو کو دنیا کا سب سے عظیم فلاسفر مانتا تھا۔افلاطون سے بھی بڑا۔عربی زبان میں اس کے بہت سے ترجمے ہو چکے تھے اور یُوسف یعقوب ہر ترجمہ پڑھ بیٹھا تھا۔مگر ہر ترجمہ دوسرے سے مختلف تھا۔اس نے ابن رُشد کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اُن سب تراجم کو اکٹھا کرے۔اس تگ ودو میں ابن رشد نے جانا کہ بہت سے خیالات جو دراصل ترجمہ کرنے والے کے اپنے تھے وہ بھی ارسطو کی سوچ میں مل گئے ہیں۔ابن رُشد نے ارسطو کی حقیقی سوچ پر آساں زبان میں کمنٹری لکھی۔عربی زبان سے پھر اُسے لاطینی میں ترجمہ کیا۔

یہی وہ کتابیں تھیں جو جب یورپ پہنچیں تب یورپ ارسطو سے متعارف ہوا۔

حقیقت ہے کہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام یورپی فلاسفرز اور دانشور ابن رُشد کے ممنون ہیں کہ یہی وہ ہستی ہے جس نے ارسطو کو دریافت کیا۔یہی وجہ تھی جس نے یورپ کے دانشور طبقے جو ایویروس کی سوچ سے متاثر تھے وہ ایویروسٹ Averroest کہلائے۔آج اگر اُسے ارسطو پر اتھارٹی کا درجہ دیا گیا ہے تو غلط نہیں۔

ابن رُشد کا کہنا ہے کہ سچ کبھی بھی سچ کا مخالف نہیں ہوتا۔فلسفی کائنات کے بارے میں جو سچ جان چکے ہیں وہی سچائی ہے اور اسی سچائی کی تلقین اسلام بھی کرتا ہے۔اسی لیے اسلام اور فلسفہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں۔گو دونوں کے راستے الگ ہیں مگر منزل ایک ہی ہے۔

ابن رُشد کے مطابق وہ مسلمان دانشور یا اسکالرز جو فلسفے کے مخالف ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے مسلمان اپنے دین سے دور ہو رہے ہیں۔دراصل بھٹکے ہوئے ہیں۔

میں نے کتاب سے نظریں اٹھا کر اپنے سامنے دیکھا تھا اور خود سے کہا تھا۔مسلم

دنیا کی اجتماعی ذہنیت کی پس ماندگی کی وجہ یہی تو ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پر اڑنا
مشکل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

المدوور گیٹ Almadovar Gate کے سامنے قرطبہ کا ایک اور بیٹا سنیکا Seneca علم کی فضیلت کا چوغہ پہنے کھڑا تھا۔ رومی فلاسفر اور ڈرامہ نگار۔

یاس وافسردگی اور ملال میں گھرنا ہو، لمبی لمبی آہیں کلیجوں سے نکالنی ہوں۔ تاریخ ہسپانیہ کے کچھ کرداروں اور کہانیوں کو ایک بار پھر یا پہلی بار سُننا ہو۔ ماضی کے عظیم الشان خلیفاؤں کی مورش تہذیب کا ورسیلز کو دیکھنا ہو یا پھر اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد کرنا ہو تو پھر ان کھنڈرات کو دیکھنے چلی جائیں جو مدینہ الزہرہ کے نام سے مشہور ہیں۔

اس شہر کی بنیادیں رکھنے والا خلیفہ عبدالرحمٰن سوئم تھا۔ عبدالرحمٰن بہت جیالا شہ زوراور تمکنت والا شہزادہ تھا۔ مردانہ حُسن وخوبصورتی کا پیکر تھا۔ جب تخت نشین ہوا تو عمر اکیس سال تھی۔ لوگ اس سے بہت خوش تھے۔ محبت کرتے تھے۔ اُسے بہت سے خطاب لوگوں نے دیئے۔ نصرالدین یا ناصرالدین سب سے زیادہ مشہور ہوا۔

912-961 تک حکومت کرنے والے عبدالرحمٰن سوئم نے اسے بنانے میں پچیس برس لیئے۔ یہ اس وقت قرطبہ کے مغربی مضافات کا علاقہ تھا قرون وسطیٰ کا رنگ لیئے۔ جس کی دیواروں میں شہر جو انتظامی اور حکومتی عہدہ دران کی عمارتوں سے سجا تھا قید ہو گیا تھا۔

یہ دور ہسپانیہ کی تاریخ کا بہترین خیال کیا جاتا ہے۔ جب مملکت میں علم وادب کا شہرہ تھا۔ مقامی گوتھ اور رومن سٹائل اور عربوں کے مروجہ طریقوں کی آمیزش سے نئے رنگ اور نئے انداز فروغ پا رہے تھے۔ موسیقی اور شاعری کا چرچہ تھا۔ علم وفن کی بڑی پذیرائی تھی۔ شہر بسانے پر ڈھیروں ڈھیر پیسہ خرچ ہوا۔

چونکہ شاہ یونان سے اس کی گہری یاری تھی۔اس کے ماہر کاریگر اور سنگ مرمر کے تحفے اُسے شاہ کی جانب سے ملے تھے۔قرطبہ کے اپنے کاریگر بھی کمال کے تھے۔سو اِس محل اور عمارات کے ستون ،فرش اور چوبی کندہ کاری سب دونوں کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔کمروں میں فوارے ہر دم موتی بکھیرتے تھے اور حماموں کی شان وشوکت اپنی جگہ بہت شاندار تھی۔اس کی تکمیل پر اسے ایک شاہکار قرار دیا گیا۔

شہر کا نام اس نے اپنی ایک کنیز کے نام پر رکھا تھا۔جس سے وہ بہت پیار کرتا تھا۔جسے اس نے اپنی ملکہ بنایا اور دل میں بسایا۔پھر اس کا سنگ مرمر کا ایک مجسمہ بھی مرکزی دروازے پر آویزاں کر دیا کہ لو بھئی خلق خدا تم بھی دیکھ لو جسے میں چاہتا ہوں وہ ایسی ہی طوفانی چاہت کے قابل ہے۔وہ یہاں بیٹھ کر اگر ملک شام کی فضاؤں اور ہواؤں کو یاد کرے تو یہ مناسب تو نہیں۔

تاہم اس پیار و محبت کی داستان کے علاوہ بھی اس کی تعمیر کی بڑی وجہ یقیناً اُن جذبوں کی تشفی کرنا تھی جو کہ طاقتور حکمرانوں کے دلوں میں اپنی برتری اور طاقت کا رعب جمانے کی نفسیاتی خواہشات کی اسیر ہوتی ہے۔

عباسیوں کا نیا دارالخلافہ بغداد جو طاقت کا نیا مرکز بن کر اُبھرا تھا۔وہ بے چین و مضطرب رکھتا تھا۔اس جذبے کے ساتھ ساتھ ہجرت کا دکھ بھی شامل تھا کہ اپنے آباواجداد کے زمانوں کا وہ شاندار دمشق اُس کی عظمت کا گہرا تاثر بھی نچلا نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔جی چاہتا تھا کچھ ویسا اِس نئے دیس میں بھی دیکھے۔

یہاں وہ بہار اور خزاں کے دنوں میں ضرور قیام کرتا۔یہ دن فطرت کے حسن سے مالا مال اور بڑے نشیلے سے ہوتے۔محل کی پشت پر جبل عروس کی سرسبز پہاڑیاں اور پستہ قامت جھاڑیاں دل لبھاتیں۔

اسے وسعت دینے اور اس کی شان وشوکت کو بڑھاوا دینے میں الحکم ثانی کا بڑا کردار ہے۔

لیکن افسوس اس شہر کی عمر اتنی کم نکلی کہ اتنے ارمانوں اور اتنے کثیر سرمائے سے بنایا گیا یہ شہر اموی حکومت ختم ہوتے ہی ایک طرح تباہ ہوگیا۔ بربروں نے اِس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

سفر تو زیادہ نہ تھا۔ یہی کوئی سات آٹھ کلومیٹر کا۔ مگر راستے کے حُسن اور دلکشی کے بڑھاوے میں حصّہ ڈالنے والے بوڑھے، عورتیں، مرد، لڑکے، لڑکیاں، چرند پرند سبھوں کا اپنا اپنا کردار تھا۔ جو بے اختیار توجہ مائل کرتے تھے۔ پارکوں میں دوڑتے پھرتے ننھے منے بچے، کبوتروں کے غول، شہر کی بلند و بالا عمارتوں اور فلیٹوں جن کی بالکونیوں میں سجے پھول اور بیلیں ان کی شان دوچند کرتیں تو وہیں دیکھنے والوں کی آنکھوں کو بھی ٹھنڈک دیتیں۔

آبادی کم ہوتی گئی۔ سرسبز و شادات کھیتوں اور فطرت کا حسن بڑھتا گیا۔ تا حد نظر ہریالیوں کا سلسلہ، اوپر چمکتا شفاف آسمان، کہیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ، کہیں کھیتوں میں کام کرتے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے ٹیکسی مرکزی شاہراہ کو چھوڑتے ہوئے نسبتاً چھوٹی سڑک پر آگئی۔ اب آہستہ آہستہ چڑھائی شروع ہوگئی تھی۔

ایک بڑے گیٹ نے ''خوش آمدید مدینہ الزہرا'' میں کا مژدہ سنایا۔ گیٹ کے اندر داخل ہوکر چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلتے پارکنگ تک گئے۔ یہ ایک طرح پہاڑی کی پشت پر تھا۔ باہر نکل کر کتنی دیر تک ہم لوگ وہیں کھڑے اپنے قدموں میں بچھے کھنڈرات کو دیکھتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور بے اختیار ہی ہونٹوں سے نکلا۔

''اُف کس قدر موہ لینے والا منظر ہے کہ سامنے قرطبہ شہر بکھرا ہوا تھا۔ پشت پر سیرا مورینا کی پہاڑیاں سبزے سے ڈھنپی ہوئی تھیں۔ من و عین اسلام آباد کے منظر۔ ان

پہاڑیوں کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے کہ یہ بڑی بدوضع اور سیاہ تھیں۔ اُس پری وش زہرہ عبدالرحمٰن سوئم کی محبوبہ دلنواز کو اس کی بدصورتی بڑی کَھلتی تھی۔ ایک دن ادا سے بولی۔

''اِسے دیکھ کر تو مجھے وہ مثال یاد آتی ہے کہ پہلوئے لنگور میں حور خدا کی قدرت۔''

عبدالرحمٰن نے اِسے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دیا۔ مگر یہ مشکل تھا۔ سوچا اور پھر حکم دیا کہ اِسے پھلدار پیڑوں اور پھول بوٹوں سے سجادو۔ اور وہ انجیر، بادام کے درختوں اور پھولدار بوٹوں سے بھر گیا۔ محل کی شان دوبالا ہوگئی۔

''اب کیا کرنا ہے بیبیو اُترائی دیکھ رہی ہو۔'' سیما نے متوجہ کیا۔

دراصل مدینہ الزہرا تین حصّوں میں تعمیر ہوا۔ شالامار باغ کی طرح تین تختے کہہ لیں۔ خیر وہاں تعمیرات تو بہت مختصر ہیں یہاں تو پورا شہر ہے۔

چلو ہمت مرداں مدد خدا پر عمل کرتے ہیں۔

ٹکٹ لیا اور اندر داخل ہوئے۔ بلندی والا حصّہ محلات پر مشتمل تھا۔ درمیانہ باغات اور کھیتوں پر سب سے نچلے حصّے میں شہر جس میں انتظامیہ کے دفاتر، کچہریاں، مساجد وغیرہ کا سلسلہ تھا۔

سُورج کی چمکتی کرنوں میں جنوبی ڈھلانوں پر بکھرا کھنڈرات کا یہ شہر جسے اب ورلڈ ہریٹیج نے اپنالیا ہے۔ بہر حال محکمہ آثار قدیمہ کو شاباش کہ اس نے ماضی کے اِس ورثے کو کھود کھود کر نکالا اور برتنوں، پتھروں، ستونوں در و بام سبھوں کو جھاڑ پونچھ کر تختوں کی تفصیلات سے انہیں سجا کر کمائی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ سب ہسپانوی زبان میں تھے۔ اب پتھروں کے ساتھ سر پھوڑنے والی بات ہی تھی نا۔

یہاں سینکڑوں سنگ مرمر کے فواروں میں بنے شیروں، زرافوں اور گھوڑوں کے

منہ سے موتی نکلتے دیکھنا بڑا دلچسپ شغل تھا۔

سائپرس اور پام کے درختوں اور ان کے گرد بکھرے بڑے ہال اور باغات جو وادی کا دلکش منظر ابھارتے تھے کو دیکھ دیکھ کر خوشی اور غم کی کیفیات میں ڈوبتے رہے۔ خوشی یہ عجائب خانہ دیکھنے اور غم مٹے ناموں کے نشان کیسے کیسے کی کیفیات تھیں۔

اب ماضی کے اُس دور میں چھلانگ لگانا بھی اچھا لگتا تھا۔ اُن کی اپنی رعایا سے محبت کی بہت سی کہانیاں اور داستانیں بھی یاد آئی تھیں۔

دارالعبدالرحمٰن کا Dar-al-Yand آرمی ہاؤس جسے وزیر ہاؤس بھی کہتے ہیں کا ہال اس کا سب سے خوبصورت حصّہ تھا۔ جس کی سجاوٹ اور آرائش وزیبائش میں اتنا حسن تھا کہ بندے کی آنکھیں پھٹتی تھیں۔ اسے ماہر آثارقدیمہ نے رِچ ہال Rich Hall کا نام دیا تھا۔ یہاں خلیفہ، سفراء اور امراء کے سامنے کبھی کبھی آتا تھا۔ اس کا ہر دوسرا کالم نیلے اور سرخ ماربل کی آمیزش سے دل کش تاثر اُبھارتا تھا۔ محرابوں کے پتھر اور اس کی ڈیزائن کاری بھی کمال کی تھی۔

نیچے اُترنے کے لئیے سیڑھیاں تھیں جو کھدائی سے نکلنے والے پتھروں سے ہی بنائی گئی تھیں۔ جی چاہتا تھا اُتر جائیں نیچے، مگر گئے گوڈے تو مانگے تانگے کے نہیں تھے کہ چھلانگیں مارتے جاتے۔ اپنے تھے اور بیمار شیمار تھے۔

تو جب آنکھوں نے اُس کندہ کاری اور دل نے اس میتھس Myths کی خوشبو کو محسوس کرنا چاہا تو میں نے دیواروں کو اُنگلیوں سے چُھوا۔ کندہ کاری اور نقش و نگاری کی باریکیوں کو آنکھوں نے دیکھا اور سراہا۔ پریوں جیسی صدیوں پرانی داستانوں کو یاد کیا اور اِس حسین تحفے کی خوشبو لطافت اور درد کو محسوس کرتے ہوئے بوجھل دل سے واپسی کی۔

☆☆☆

باب نمبر:12 میڈرڈ کے لیے واپسی

- ترقی یافتہ ملکوں میں بھی عورت مرد کے تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔
- مانگنے کے انداز میں تہذیب تھی۔ رکھ رکھاؤ اور ظرف تھا۔
- مورش والز کے کہیں کہیں موجود کھنڈرات اُس عہد کی یاد دلاتے ہیں جو کہیں تاریخ کے صفحات میں زندہ ہے۔

اسے میرا ایک ڈر یا خوف کہہ لیجئیے۔ کچھ شرمندگی یا کچھ بے عزت سا ہونے کے احساس کا نام دے لیں۔ یہ حقیقت تھی کہ سارے سفر کے دوران میرا اندر ڈوبتا ابھرتا رہا تھا۔

''خدایا ہوٹل اچھا ہو۔ لوکیشن بھی اچھی ہو وگرنہ ان نٹینوں کے سامنے خفّت کا سامنا ہوگا۔ لوجی بڑے قصیدے پڑھتی تھی مالک کے۔ ساری قلعی کھل گئی۔

اب ذرا تھوڑا سا ذکر اِس کیفیت کا بھی سُن لیں۔

تو اب جب خاصے ذلیل ہوگئے اور میرے خیال میں سیما لوگوں کو بھی سبق مل گیا اور یہ پیش کش بھی کہ مالک سے کہو وہ میڈرڈ میں بکنگ کروادے۔ اور کچھ اس طرح کی ستائش بھی کہ عبدالمالک کتنا پیارا بچہ ہے۔ ہمہ وقت خدمت کے لئیے مستعد۔ جب مشکل میں اُسے آواز دو وہ الہ دین کے جن کی طرح حاضر ہو کر صدا لگاتا ہے۔ جی آنٹی حکم۔

تو اب لازم ٹھہرا کہ مالک کی خدمات حاصل کی جائیں۔

اب یہ دردسری تو مالک کی ٹھہری کہ ہماری بکنگ studios-sol mayor ہماری شرائط کے ساتھ ہو کہ کمرہ ایک، ہوٹل شہر کے عین وسط میں اور سستا بھی۔ میں صدقے

جاؤں بجے کے کہ اُس نے تین گھنٹے بعد خوش خبری سُنا دی کہ 60 یورو پر کمرہ studios-sol mayor میڈرڈ کے دل میں ہے۔ ہاں بس خیال رکھنا ہے تو اتنا سا کہ آپ لوگوں نے تین بجے سے پہلے نہیں ہوٹل میں داخل ہونا۔

لو تین کیا ہم چار بجے جائیں گی۔ باہر کہیں بیٹھ جائیں گے۔ نظارے لوٹتے لوٹتے وقت گزرنے کا تو پتہ بھی نہیں چلے گا۔

اب ہوا کیا؟ ہم تو عین ڈھائی بجے جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔

''اچھا مولا تو ہی عزت رکھنے والا ہے۔'' خود سے کہتے ہوئے اپنے گردوپیش کو دیکھا۔ ایک وسیع و عریض میدان سامنے تھا جو چاروں طرف سے بلند و بالا عمارات کے جیسے نرغے میں گھرا ہوا تھا۔ میدان میں فوارے سے موتی برستے تھے۔ ذرا فاصلے پر ایک شہ سوار گھوڑے کی پشت پر سوار نظر آیا تھا۔ ذرا آگے تھوڑے فاصلے پر ایک ریچھ کو ایک پیڑ پر لگے سٹرابیری کے پھل پر منہ ماریاں کرتے دکھایا گیا تھا۔

سڑک کے کنارے ایک گلیارے کی جانب ٹیکسی ڈرائیور نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ کی مطلوبہ جگہ۔''

ٹیکسی والے کو ادائیگی کرنے اور اس کے رُخصت ہو جانے کے بعد ہم نے سکون سے کھڑے ہوتے ہوئے گردوپیش کا جائزہ لیا۔

جی نہال ہو گیا کہ ہوپ آن اور ہوپ آف خراماں خراماں ہمارے پاس سے گزر رہی تھی۔

''لو بھئی مزے ہو گئے۔ بس سٹاپ تو قریب ہی ہو گا۔

دونوں کو سامان کے پاس چھوڑتے ہوئے میں اُس گلیارے میں داخل ہوئی

جہاں راہداری ختم ہوتی تھی۔ وہاں تو ایک بہت بڑا مختلف حصّوں میں منقسم بظاہر ایک ویڈیو گیمز کا سینٹر جان پڑا۔ بڑا طلسمی اور پُراسرار سا ماحول تھا۔ سناٹا تھا۔ چند لمحوں کے لئے تو مجھے اُس پر کسی جوا خانے کا بھی گمان گزرا۔ ایک سے راہنمائی چاہی مگر کوئی بات کرنے کو تیار نہ تھا۔

اب کیا کروں؟ عجیب معاملہ درپیش تھا۔ پھر بھاگتی ہوئی ایک اور حصّے میں داخل ہوئی۔ انہوں نے پتہ دیکھا۔ کسی سے بات کی۔ چند لمحوں بعد دروازے سے نکل کر داہنے ہاتھ نیم تاریکی میں سٹیل کلر کے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ لفٹ ہے۔ اس سے اُوپر جایئے گا۔ آپ کا ہوسٹل تھرڈ فلور پر ہے۔ سیکنڈ فلور پر آفس ہے۔ اُن لوگوں نے کہا ہے۔ تین بجے آپ کو چیک ان کروائیں گے۔

چلو تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ باہر آئی۔ سڑک کے کنارے پتھر کے گول ڈنڈے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''بھئی ابھی تو انتظار کرو۔''

تاہم یہ اطمینان تھا کہ جگہ بڑی بارونق اور مرکزی ہے۔ کھانے پینے اور بیکری کی دکانیں افراط میں تھیں۔ لوگوں کے پُرے کہیں میدان میں مٹر گشت کرتے، کہیں فوارے کے چبوترے پر بیٹھے، کہیں کھڑے، کہیں دکانوں میں گھستے باہر نکلتے نظر آتے تھے۔

ڈھائی بجے کا سورج اپنی تمام تر روشنیوں کے ساتھ سکوائر کے آدھے میں روشنیاں بکھیر رہا تھا۔ آدھا حصّہ سائے میں آچکا تھا۔

آسمان کی کشادگی اور نیلاہٹ دونوں آنکھوں کو بھلی لگی تھی۔ داہنے ہاتھ سامنے کے رُخ غالباً کوئی چرچ تھا۔ بالکونی کے اوپر بنی کنوپی میں گھنٹیاں نظر آتی تھیں۔

تین بجے لفٹ کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ لفٹ بند۔ اب پریشان کھڑے

ہیں۔اسی دوران دوعورتوں اور تین مردوں کا ایک ٹولا آ کر کھڑا ہو گیا۔فوراً انہیں اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔انہوں نے مسئلہ سمجھا اور بات کروائی۔

بس تو چند لمحوں میں لفٹ کا دروازہ کھلا۔دو بندے آئے اور بولے ’’تین نہیں بجے ابھی۔تاہم چلیئے اوپر۔کمرے کی صفائی ہورہی ہے۔‘‘

چلو دل میں شکر شکر کہا۔دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ہمارا حال بھی کچھ ویسا ہی تھا۔

بڑے بڑے دروازوں،غلام گردشوں اور چوبی زینوں والی یہ عمارت شاید کبھی کسی لارڈ یا نواب کا مینشن رہی ہوگی جسے بدلتے وقت کے ہاتھوں ہوٹلوں اور ہوسٹلوں میں بدل دیا گیا تھا۔کمرہ کشادہ تین خوبصورت بیڈوں سے سجا کچن کے لازمے سے آراستہ اور چھوٹے سے سٹور اور شاندار باتھ روم سے مزین۔سچی بات ہے دل تو رقص کرنے لگا تھا۔یہاں تو ایک اور بندے کی بھی گنجائش آسانی سے نکل سکتی تھی۔

’’مالک زندہ باد۔سامنے ہوتے تو ماتھا چومتی۔اب ہماری دعائیں لو۔‘‘ دل شکرگزاری سے سرشار ہوا کہ عزت کا بھرم ہی نہیں رہا بلکہ اس میں خاطرخواہ اضافہ بھی ہوا۔پردیس میں ہرطرح کی پریشانی سے بھی بچے۔لفٹ سے نیچے اُترو تو بھرے میلے میں اُتر جاؤ۔

سامان ٹھکانے لگایا۔چائے بنائی۔ایک ایک کپ نے توانائی دی۔اب کھانے اور سیر کے لئیے باہر نکلے۔ہوپ ان ہوپ آف کا پروگرام کل پر رکھا۔

اس وقت ایک بھرپور نظر جو طمانیت کی سرشاری سے پور پور بھیگی ہوئی تھی آسمان اور ماحول پر ڈالی۔ایک نیا منظرنامہ دونوں کی شکلوں میں سامنے آیا۔جس نے دل لُبھایا۔آئے تھے تو آدھا سکوائر دھوپ اور چھاؤں سے بھرا ہوا تھا۔اب دھوپ تو سامنے والی

عمارتوں کے بنیروں پر مزے سے بیٹھی مسکراتی تھی۔اور چھاؤں سارے میں پیر پسارے جگمگاتی روشنیوں میں نہا رہی تھی۔

جذباتیت کا پہلا حملہ شاید میرے فراغت بھرے سکون کے لمحات کا جیسے منتظر ہی تھا۔اسی لیئے دوڑا دوڑا آیا اور مجھے دل گداز سے انداز میں سب سُنانے لگا۔

جانتی ہو یہ میڈرڈ جو اس وقت انتہائی ترقی یافتہ شہر کی صورت تمہیں شک وحسد میں مبتلا کرر ہا ہے۔صدیوں پہلے ایویں سا شہر تھا۔کبھی مسلمانوں اور کبھی عیسائیوں کے زیر تسلط۔کوئی ساڑھے تین صدیوں سے کچھ زیادہ موروں نے اس پر حکومت کی۔یہ کنگ فلپ تھا جس نے اسے اہم سمجھا اور دارالحکومت کا درجہ دیا۔نام پہلے تو مجریط Mageterit جس کا مطلب ہے قلعہ جو Manzanars دریا پر بنا ہو۔

میری فرمائش پر موتی برساتے فوارے کی بنّی پر بیٹھنے کا کام ہوا۔آخر دنیا بھر سے آنے والے رنگا رنگ لوگوں کی کہیں خوبصورتیوں،کہیں بدصورتیوں کے یہاں وہاں بکھرے رنگ اور عکس دیکھ دیکھ کر محظوظ ہونے کا اِس سے زیادہ حسین موقع کہاں ہوسکتا تھا؟

دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ سکوائر کی بلندوبالا عمارتوں کی چوٹیوں سے بھی غائب ہوگئی۔ برقی رروشنیوں نے جگمگ جگمگ کرتے ہوئے اپنی فسوں خیزی کا بکھراؤ مزید تیز کردیا تھا۔پختہ سکوائر کے عین بیچوں بیچ بنا فوارہ اپنے کناروں پر بیٹھے خوش گپوں میں مگن لوگوں سے بے نیاز موتی برسائے چلا جارہا تھا۔

دفعتاً پولیس کی زور زور سے ہوٹر بجاتی گاڑیاں سکوائر میں داخل ہوئیں۔ہم چاروں طرف حیرت اور تجسّس سے بھری آنکھیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کیا کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے؟ کاتالونیا کے ایشو نے بھی پوری دنیا کی توجہ کھینچ رکھی ہے۔کہیں اس سلسلے میں تو نہیں یہاں کچھ گڑ بڑ ہوگئی ہے۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی جب پریشانی میں اُوپر پہنچے تھے اور مینجر ٹائپ ملائشیائی بندے نے پرتپاک استقبال کرتے ہوئے محبت وخلوص کی بارش میں بھگوتے ہوئے کہا تھا۔

''بیٹھیئے بیٹھیئے ۔بس تھوڑا سا انتظار۔اطمینان سے کمرہ صاف ہونے دیں اور ہاں ٹی وی دیکھیں۔''

ٹی وی پر دیکھا تو بڑا شوروغوغا نظر آیا۔کاتالونیا کی پارلیمنٹ کی جھلکیاں دکھائی جارہی تھیں۔زبان کی خاک سمجھ آنی تھی۔اِسی پَل سے ملائی بندے سے پوچھا جوشکر ہے انگریزی بول لیتا تھا۔اس نے بھی ٹی وی پر دیکھتے ہوئے مقرر کی گھن گرج والے لب و لہجے کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔

میڈرڈ کے لوگوں کا کہنا ہے انہیں سکون لڑنے لگا ہے۔اسپین سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں۔اپنی الگ ریاست بنانے کے خواہش مند ہیں۔ایوان سے ستر(70) نے آزادی کے حق میں،دس(10) نے مخالفت میں ووٹ دیئے ہیں۔اوردو(2) نے ووٹنگ میں حصّہ نہیں لیا۔

اب حال دیکھو ایک دوسرے کو مبارکبادیں دے رہے ہیں۔ریلیاں نکال رہے ہیں۔

میں نے پوچھا تھا۔انہیں آزادی ملنے کا چانس ہے۔

ہرگزنہیں۔اس کا حتمی جواب تھا۔گورنمنٹ ایکشن لے گی اور اِن جیالوں کو بٹھا دے گی۔کون اپنے زندہ وجود کے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔

بہرحال یہاں ایک نیا ہی اشو سامنے آیا۔اب جو دیکھتے ہیں کہ خواتین کا ایک جتھہ ہاتھوں میں کاسنی رنگے بڑے بڑے بینر لیے تیز تیز قدموں سے چلا آرہا ہے۔کچھ کے ہاتھوں میں بھونپونما لاوڈ سپیکر،کچھ کے پاس چھوٹے مائیک۔چند پوسٹر اٹھائے ، چند

کے ہاتھوں میں پیلے رنگ کے بڑے بڑے شاپر اور چند کم از کم ساڑھے چار میٹر لمبا انجانی عبارت سے بھراپُر ابینر تھامے ہوئے ہیں۔

آتے ہی انہوں نے ہماری سمت کے ایک گوشے پر قبضہ کیا۔گروپ میں سے چند عورتیں نکلیں۔زمین پر بیٹھ کر انہوں نے مستطیل ٹائپ پمفلٹوں سے جن پر عورت کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور نیچے ہسپانوی زبان میں کچھ درج تھا۔ایک بڑا سا بیضوی سرکل بنایا۔اس بیضوی دائرے میں انہوں نے بہت مہارت اور پھرتی سے سفید موٹے کاغذ کی بنی ہوئی نسوانی تصویریں جمائیں۔ان چھ سات تصویروں کے ہاتھوں پیروں کے مختلف انداز احتجاجی حرکات کے نمائندہ تھے۔ان تصویروں پر کہیں گردنوں، کہیں چہروں، کہیں پیٹ پر سرخ نشان جولہو کی علامت تھے نظر آتے تھے۔

اِس ساری کاروائی میں بمشکل کوئی پندرہ منٹ صرف ہوئے ہونگے۔فوارے کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے جب تک منظر سامنے رہا، بیٹھے بیٹھے دیکھنے پر اکتفا کیا۔تاہم جب لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونا شروع ہوگیا۔اور بصارت متاثر ہوئی تب میں نے بھی اٹھنے اور وہاں جا کر اس تماشے کا حصّہ بننا ضروری سمجھا۔اب ایک منظّم انداز میں احتجاج شروع ہوا۔عورتوں کی نعرہ بازی، تقریریں، ہاتھوں بازوں کا ہوا میں لہرانا۔ماجرہ کیا ہے؟ پلّے تو کچھ نہیں پڑ رہا تھا کہ کاروائی ہسپانوی زبان میں تھی۔چند ایک سے پوچھا مگر انگریزی سے ناواقف۔اب بات جانوں تو کیسے؟ مجھے بھی اُچھل پیڑے (بے چینی) لگے ہوئے کہ کچھ راز تو کُھلے۔

پھر ایک خاتون میرے تجسس اور کچھ جاننے کی لگن دیکھتے ہوئے مجھے ہاتھ سے تھام کر گروپ کی ایک جوشیلی سی کارکن کے پاس لے گئی جس نے مجھے بتایا کہ دراصل یہ احتجاج ہسپانوی عورتوں پر بہیمانہ تشدد اور بربریت کے سلسلے میں ہے۔اس سال اب تک 52 عورتیں مردوں کے تشدد کی بھینٹ چڑھتے ہوئے مرگئی ہیں۔کوئی 220 کے قریب زخمی

ہوئی ہیں۔

میں نے حیرت سے دبلی پتلی خاتون کو دیکھا اور بے اختیار کہا۔ میں بہت حیران ہو رہی ہوں۔ اس ترقی یافتہ مغربی معاشرے میں بھی عورت کے ساتھ یہ سب ہو رہا ہے جب کہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ظلم اور ناروا سلوک کے ایسے سب انداز ہمارے لوگوں کا ہی چلن اور شیوہ ہے۔ خاتون نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

مرد مرد ہے۔ کتنا بھی مہذب کیوں نہ ہو جائے اس کے اندر کا جنگلی پن کہیں نہ کہیں نکل آتا ہے۔ ہمارا احتجاج اُن کے لیے کڑی سزائیں اور عورت کے تحفظ کو مزید یقینی بنانا ہے۔

اخبارات کے نمائندے کھٹ کھٹ تصاویر بنا رہے تھے۔ یقیناً ٹی وی کے کچھ چینلز کے نمائندے بھی تھے وہ کچھ عورتوں سے باتیں کر رہے تھے۔ سوا ڈیڑھ گھنٹے کا یہ شو میرے لیے بہت سے سوالیہ نشان چھوڑ چکا تھا۔

میرے اندر ایک کمینی سی خوشی و سرشاری کا احساس موجزن تھا جب میں واپس آ کر فوارے کی بنّی پر بیٹھی تھی۔ میرا جی شدت سے چاہا تھا کہ اپنے ملک کی اُن سب ترقی پسند خواتین جنہیں ہماری معاشرت کی ہر بات میں کیڑے نظر آتے ہیں یہ تصویریں دکھاؤں۔ شرمین عبید چنائے تو بہت شدت سے یاد آئی تھی۔ آسکر ایوارڈ یافتہ۔ جس نے پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ترقی پذیر معاشرے کی تیزاب سے جلی عورت کو نمایاں کیا اور شہرت سمیٹی۔

اب اسی سے ملتی جُلتی ایک تصویر میڈرڈ کے اِس سول سکوائر میں دیکھی تھی۔ پچاس مری ہوئی عورتیں اور 220 ایسے ہی کہیں کٹی پھٹی، کہیں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں، گوڈوں اور کہیں جلے چہروں اور جسموں والی عورتوں کی تصویریں۔ ایک نہ دو۔ پوری دوسو

ہیں۔سپین جیسے ترقی یافتہ ملک کی تعلیم یافتہ خودمختار وخودکفیل عورتوں کی جو مردوں کی بربریت کی بھینٹ چڑھی تھیں۔

شام رات کے پہلے پہر میں ڈھلنے لگی تھی۔اب نئے مناظر میدان میں داخل ہورہے تھے۔یہ مانگنے کے بڑے مہذب انداز تھے۔پورا Sol سکوائر ان سے بھر گیا تھا۔کہیں ایک معمر خاتون کرسی پر بیٹھی ماؤتھ آرگن بجارہی تھی۔سامنے ڈبہ پڑا تھا۔آپ کا جی چاہتا ہے کچھ دیر رُک کر اس کی موسیقی سُنیں۔اُس سے محظوظ ہوں۔اس کے ساتھ تصویر بنوائیں۔جی چاہے پچاس سینٹ یا ایک یورو کا سکہ ڈبے میں ڈال دیں یا نہ ڈالیں۔کوئی مجبوری نہیں۔آپ کی مرضی۔

ذرا آگے بڑھیئے۔ایک نوجوان سارا چہرہ پینٹ کیے اپنے سامنے میز پر شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھا ہے۔ذرا اگلے ایک اور منظر راستہ کھولتا ہے۔دو فوجی بندوقوں آہنی کنٹوپوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔چہرے پینٹ شدہ۔

گھوم جایئے دوسری طرف۔یہاں رنگ و بو کا طوفان آیا ہوا ہے۔ایک میوزیکل گروپ اپنے آرٹسٹوں کے ساتھ گیت گا رہا ہے۔رقص کررہا ہے۔تماشائیوں میں سے بھی کچھ جوڑے شامل ہوجاتے ہیں۔رقص، گیت، خوشی سرشاری۔

کوئی پینٹ شدہ چہرہ ڈریکولا کا روپ دھارے آپ کو ڈرا دیتا ہے۔کوئی عورت موٹر سائیکل پر ہاتھوں کے اوپر اپنے پورے وجود کو فضا میں بکھیرے کھڑی آپ کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتی ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ صرف دو ہاتھوں پر اس کا سارا وجود فضا میں کیسے پھیلا ہوا ہے؟

ایسے ہی تفریحی انداز میرے ملک میں بھی ہیں۔بس تھوڑا سا تڑکا ماڈرن ازم اور رویوں کے حُسن کا ہے۔جو مجھے یہاں نظر آتا ہے۔ہم بہت رات گئے اِن سب کھیل

تماشوں کا حصّہ بنے رہے۔کہیں نظروں سے لالچ اور طلب کا سوال نہیں تھا۔ جو دے اس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اس کا بھی بھلا جیسے سچے اور سُچے رویے کی جھلک تھی۔

یہ حقیقی انداز ابھی ہمارے ہاں نہیں۔ یہاں دھانسو اور آپ کی جان کھا لینے والا انداز ہے کہ آپ اگر کچھ عنایت کیئے بغیر چل دیئے تو آپ کی سات پیڑھیوں تک بددعائیں آپ کا تعاقب کرتی ہیں۔

رات کا دوسرا پہر تھا اور یہ کاروبار زندگی اسی طرح اپنے عروج پر تھا۔اُس وقت ایک ہوک سی میرے دل سے اٹھی تھی۔ میرے اللہ میرے ملک میں وہ وقت کب آئے گا جب اس کے کوچہ و بازار غیر ملکیوں سے ایسے ہی سجیں گے۔اس کے ہوٹلوں، اس کے پرانے اندرون شہروں کے گلی کوچوں میں اُن کا رش ہوگا۔

میں اپنی یادداشتوں میں محفوظ وہ منظر نہیں نکال سکتی ہوں۔86 - 1985 کا وہ وقت جب پاکستان کے شمالی علاقہ جات غیر ملکی سیاحوں کے ٹولوں سے بھرے نظر آتے تھے۔ٹولیاں، جتھے، جب جب میرا اِن علاقوں میں جانا ہوا۔ہوٹل اِن کے قبضوں میں، سڑکوں پر ان کے پرے، دریاؤں کے کناروں پر بیٹھی اِن کی ٹولیاں، کھانا کھانے کے لیے کسی ہوٹل میں چلے جاؤ۔ وہاں کی میزوں کرسیوں پر گورے گوریاں براجمان۔

مجھے یاد ہے ہنزہ کے ایک ہوٹل میں کھانا دیر سے لانے پر میں نے ہوٹل کے مینجر سے شکایت کی جس نے میری طرف دیکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

آپ تو اپنی ہیں۔ اِن لوگوں کی طرف ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک آتے ہیں۔ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارے کلچر اور ثقافت کی پرموشن کرتے ہیں۔ہم پر لکھتے ہیں۔ ہماری چوٹیاں سر کرتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو یہاں آنے پر اُکساتے ہیں۔اب یہ لوگ جرمن ہیں۔ ہنزہ کی علاقائی زبانوں بروشسکی اور وخی پر تحقیقی

سلسلے میں آئے ہوئے ہیں۔

میں اُن کے پاس چلی گئی تھی۔اُن سے خوب گپ شپ رہی۔تو اِس چہکتے مہکتے اجنبی دیس کے اِس سکوائر میں بے اختیار میرے لبوں پر وہ دعا ابھری ہے۔خدایا میرا وطن امن اور سکون کی جنت بن جائے۔(امین)۔اس کے گلی کوچے اس کے پہاڑ اور میدان سیاحوں سے بھرتے رہیں۔

بھوک زوروں پر تھی اور ہم بھی کِسی مسلمان کے حلال ریسٹورنٹ کی تلاش میں تھے۔کہیں بغلی گلیاں کشادہ تھیں اور کہیں مناسب۔سبھوں میں جابجا کھانے پینے کے سلسلے جاری تھے۔ہماری فوڈ سٹریٹ کی طرح یہاں بھی لڑکے بالے گھومتے پھرتے گاہکوں کو پھنسا رہے تھے۔اسی طرح کے ایک بغدادی لڑکے سے ٹکراؤ ہوا جس نے چند عراقیوں کے ریسٹورنٹ کا بتایا کہ جہاں کا کھانا ہم اطمینان سے کھا سکتے تھے۔

اب اِس کے پیچھے چل پڑے۔چلتے جارہے ہیں۔چلتے جارہے ہیں۔پوچھتے ہیں بس ذرا سا آگے،ذرا سا آگے کرتے کرتے دو فرلانگ چلا دیا۔کتنے ریسٹورنٹ ہمیں آوازیں دیتے رہ گئے۔کیسی کیسی خوشبوئیں پاؤں میں لپٹتی بُلاتی رہ گئیں۔دراصل ہماری مسلمانیت کو بھی تو ٹکا(چین)نہیں تھا۔اب ایک گلی میں مڑے اور یہیں اُن بغدادیوں کا طعام خانہ تھا۔رش نہیں تھا۔

''ہائے'' دل پر گھونسہ پڑا لوگ کیوں نہیں یہاں۔بیچارے مظلوم عراقی اِن مغربی طاقتوں اور اپنوں کے زخم خوردہ۔کھانا بلاشبہ حلال تھا۔مگر تھا کیا؟مینو تو بڑے نامانوس سے ناموں پر مشتمل تھا۔چاول تھے مگر ساتھ میں کیا الّم غلّم تھے۔بہرحال برگر منگوائے۔سب کے سب بے سوادے۔بس پیٹ کا دوزخ بھرنے والی بات تھی۔اورنج جوس کا پوچھا۔وہ نہیں تھا۔نسواری شربت جو کوکا کولا تھا سامنے رکھ دیا گیا۔

ہاں البتہ قہوے نے لُطف دیا۔مزے کا تھا۔

پتی کا پوچھا۔ پتہ چلا یہی ہماری ہی جان جگر لپٹن ہے مگر یہ کیا یہاں اِس حسینہ نازنین کا کوئی دوسرا رُوپ ہے۔ایسی معطر مہک کہ پورا کمرہ مسحور کن خوشبو سے بھر گیا تھا۔ ہمارے ہاں تو دل نوازی کا یہ سلسلہ نہیں تھا۔تو گویا نمبر ون اور نمبر تین والا چکر ہے۔

تیسری دنیا کے ماٹھے ملک جنہیں یہ بڑے سوداگر جو مرضی بھیج دیں چورا ہو یا بلا سے کچرا مچرا۔ ہماری آنکھوں سے ٹپکتے اِس ندیدے پن کو بے چارے عراقیوں نے محسوس کیا اور پتی کے سُرخ ڈبے میں سے تھوڑی سی کاغذ میں ڈال کر دے دی۔ممنونیت نے آنکھیں گیلی کر دیں۔ جو بھی کہہ لیں اپنے تھے نا۔آنکھوں کو پڑھ لیا۔ہم نے بھی طے کر لیا تھا کہ میڈرڈ میں جتنے دن ہیں کھانا یہیں کھانا ہے۔ چاہے اچھا، چاہے بُرا۔ چلو خیر۔

اپنے گھر کی ہمسائی بیکری سے صبح ناشتے کے لیے خریداری کی۔شوکیسوں میں دھری چیزوں میں سے جو آنکھوں کو بھلی لگتی تھیں بس انہی کی طرف اشارہ کرتے۔ ماشاءاللہ سے دس یورو میں خاصی چیزیں آ گئیں۔ بیڈ مزے کے تھے۔ دودھ جیسی اُجلی چادریں، تکیے بھی بہتیرے۔ہلکی پھلکی پولسٹر کی رضائیاں۔ بڑے بیڈ پر لیٹنے کی آفر میں نے سیما کو کی کہ وہ دل کی مریضہ تھی اور بار بار کی۔مگر اُس نے سنگل بیڈ کو ترجیح دی۔شاید وہ مجھے میری گذشتہ محرومیوں کی تلافی کرنے کے موڈ میں تھی۔ایک کُھلے ڈلے بیڈ پر پڑے روئی کے گالوں جیسی نرمی اور گرمی والے تکیے پر سر رکھتے ہی کہیں خوابوں ہی دنیا ہی تھی جہاں جا بسیرا کیا تھا۔صبح ناشتے کی تیاری میں وہ دونوں سرگرم تھیں۔

اب یہ بات ہمارے بُھس بھرے بھیجے میں نہیں آ رہی تھی کہ آخر کھانے اور ناشتے کے لیئے ایسے بلند و بالا سٹول اور میزیں بنانا کیوں ضروری ہیں؟ بندہ جیسے گھوڑے کی کاٹھی پر چڑھ جائے۔ میرے جیسی پستہ قامت کو پہلے بیٹھنے میں دشواری۔ اگر او کی سوتی (بمشکل) یہ

مرحلہ طے بھی کر لے تب بھی پاؤں تو نیچے لٹکتے ہی رہیں۔ نہ کھانے کا سواد، نہ چائے پینے کا مزہ۔

میں نے اپنا کپ اٹھایا۔ پلیٹ میں ناشتے کی چیزیں رکھیں جو پیسٹری اور شہد لگا بند نما پیس پر مشتمل تھیں۔ اپنے بیڈ پر آ گئی یہ کہتے ہوئے کہ مجھ سے تو ٹکریں نہیں ماری جاتیں۔

اب میں تو ٹھہری اٹھائی گیروں اور پٹر واسنوں والے طرزِ عمل والی۔ بال بناؤں کِس کے لیے اور کپڑے پہنوں کِس کے لیے؟ کہیں کوئی ستائش بھری نظر وطن میں نہ تھی تو پردیس میں کِس نے دیکھنا اور توجہ کرنی ہے۔ اسی لیے میں اِس بننے سنورنے والی مشقت کے چکر میں پڑتی ہی نہیں۔ اب وہ دونوں اللہ جھوٹ نہ بلوائے نک سک سے آراستہ پیراستہ نہ ہولیں تو قدم باہر دھرنے کا سوال ہی نہیں۔ چلو خیر کرلیں اپنا راانجھا راضی۔

میڈرڈ شاید یورپ کے باقی شہروں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ ہوپ آن اور ہوپ آف پر چڑھے۔ دو چکر کاٹے۔ دوسری روٹ کی بس پر بیٹھے۔ عمارتوں کی بلند قامتی، تعمیری انفرادیت، اُن کے منہ ماتھے مجسموں سے سجے، رنگ وروغن کے غازے سے لپے پتے، پارکوں کی خوبصورتی اور پھول بوٹوں کے رنگوں کی رعنائی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سکوائرز کی کشادگی اور لوگوں کے جمگھٹے سبھوں کی دید سے لُطف اٹھایا۔

تاہم یہ کہنا پڑے گا کہ چند جگہیں تو ایسی تھیں کہ لگتا تھا جیسے سانس کہیں سینے میں رُک جائے گا اور آنکھیں انہیں دیکھتے دیکھتے پتھرا جائیں گی۔ پلازہ میئر Mayor تو وہیں ہمارے ہمسائے میں ہی تھا۔ رات کا کھانا کھا کر نکلے تو یونہی گھومتے گھومتے وہاں جانکلے۔ اب چاروں طرف عمارتوں سے گھرے ایک قدرے مستطیل سکوائر کو دیکھتے ہیں۔ عمارتی ڈھانچے کی خوبصورتی اُن کا قد اور تناسب سب بار بار متوجہ کرتے

تھے۔مناسب فاصلوں پرمحرابی گلیارے دوسری سمتوں کی جانب راستے کھولتے تھے۔

سکوائر Prado تو مجھے کچھ یوں لگتا تھا جیسے سارے میڈرڈ کی جان ہو۔ایک تو یہاں آرٹ کے شاہکاروں کی بہت فراوانی تھی۔دوسرے قرونِ وسطیٰ Medieval Lines کے طرز تعمیر کی جھلکیاں بھی نظر آتی تھیں۔سترھویں اوراٹھارویں صدی کے رنگ جھلکیاں مارتے اوراپنی کہانیاں سناتے تھے۔پراڈومیوزیم کابھی دیکھنے سے تعلق تھا۔چارلس سوئم نے اِسے جورعنائی عطا کی اُسے خراج پیش نہ کرنا یقیناً بڑی احسان فراموشی ہوتی۔

فوارے اوراُن پرآویزاں مذہبی،روحانی اورتصوراتی شخصیات حُسن کوکس قدر بڑھاوادیتی تھیں۔

دو بجے ہم لوگ رائل پیلس دیکھنے کے لئیے اُتریں۔اس وقت دھوپ کی تیزی اپنے جوبن پرتھی۔وسیع وعریض میدان اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ بکھرانظرآتا تھا۔کہاجاتا ہے سکوائراوربینٹ کی آرائش وزیبائش اوراس کی کشادگی اورحسن دراصل جوزف بوناپارٹ کی تمناتھی۔فوارے کی چھت پرگھڑسوارمجسمہ فلپ چہارم کا ہے۔سامنے محل کی مشرقی سمت اپنی کھڑکیوں اوردروازوں سمیت نظرآتی ہے۔فواروں کے موتی،درختوں کی چھاؤں میں گرینائٹ کے چبوتروں پرکھڑے سپین کی تاریخ کے نامور بادشاہوں کے مجسمے آپ کواپنے اپنے وقتوں کی کہانیاں سناتے تھے۔

پتہ نہیں میرادل محل دیکھنے کوکیوں نہیں چاہا۔میں لورکا کا میوزیم یہاں میڈرڈ میں بھی دیکھنا چاہتی تھی اورمجھے فلمینکورقص دیکھنے کی بھی بڑی خواہش تھی۔چاہتی تھی کہ کہیں سے کچھ پتہ ملے تواِس حسرت کی بھی پیاس بُجھالوں۔

میڈرڈ کے باغات کا بھی دیکھنے سے تعلق ہے۔بنانے اورسجانے میں وہ جذبہ اور

حُسن نظر آتا ہے جو زندہ قوموں کے مزاج اور بالغ نظری کا عکاس ہے۔

یہ itinerary کئی لحاظ سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ایک تو پارکوں کی بہتات اور پھر پارک بھی ایسے جن میں نہ صرف فطرت مسکراتی ،ہنستی اور آپ کو ہنساتی اور خوش کرتی ہے بلکہ آرٹ کے نادر اور خوبصورت شاہکاروں سے یہ بھی بتاتی ہے کہ لوگ آرٹ کے قدر دان اور فنکار ملک کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

گائیڈ مورش والز کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔محمد اول کی کوئی نویں صدی کی دوسری دہائی کی تعمیر۔چلو اِس شہر میں بھی کچھ تو نشان اُن لوگوں کے باقی ہیں جن سے کہیں ناطہ جڑا ہوا ہے۔

اس کی تو اب باقیات کا کچھ ہی حصّہ رہ گیا ۔لوگوں نے مکانات بنا رکھے ہیں۔ان کے پتھر وتھر سب عمارتوں میں استعمال ہوگئے ہیں۔کھیتڈرل ال مودانہ Almudena بھی بڑا شاندار تھا۔

پرانے زمانے بھی اچھے تھے۔ایک تو بادشاہوں کا زمانہ۔دائیں بائیں ہمسائے بھی بادشاہوں والے چنگلوں میں ہی جکڑے ہوئے۔پھر بیاہ شادیاں بھی ہمسائیوں کے ہم مرتبت لوگوں میں ہی۔اب فلپ دوم آسٹریا کی شہزادی جونانہ سے بیاہ رچاتا ہے۔اور ملکہ پلازہ کی بنیادیں رکھتی ہے۔اسے مناسٹریوں سے سجاتی ہے اور اپنے نام کا جھنڈا کھڑا کرتی ہے۔

پلازہ دی اسپانہ بھی کمال کا تھا۔اتنا خوبصورت،عمارتوں سے ہی نہیں پھولوں اور پیڑوں سے بھی سجا ہوا۔

نیشنل لائبریری میں ضرور میں دو گھنٹے گزارے۔لُطف بھی آیا۔کاش کاش کی صدائیں بھی کلیجے سے نکالیں۔شان وشوکت،وسعت،موڈرن سامان سب کو دیکھنا اور سمجھنا

گو مشکل تھا تاہم لطف آیا۔ساتھ ہی آرکیالوجی کی عمارت بھی تھی جس کی طرف میں نے کوئی توجہ نہ کی ۔ہاں البتہ ویکس میوزیم ضرور دیکھا جہاں ہمارے برصغیر کی وہ مدر ٹریسا لیڈی ڈیانا کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے کھڑی نظر آتی ہے۔کیا شخصیت تھی۔

بس پر چڑھتے ہوئے خود سے کہا تھا۔اب اگر اُتروں گی تو کسی ایسی جگہ جہاں کچھ کھانے پینے کا سلسلہ ہو۔تھوڑی سی منہ ماری بھی طبیعت کو ذرا مسرور کر دیتی ہے۔کچھ تھکن بھی کم ہونے لگتی ہے۔یہ روٹ جانے کون سا تھا۔شاید نواح شہر تھا۔اتنا سبزہ کہ آنکھیں جیسے اس میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔آسمان کی نیلاہٹیں،درختوں کے سلسلے،کھیت کہیں خالی اور کہیں سبزے سے لدے پھندے۔یقیناً سبزیاں ہوں گی یا کچھ گندم مکئی کا سلسلہ ہوگا۔دور سے بس وہ اپنی صورتوں سے آشنائی ہی کروا رہے تھے۔اپنا آپ کھول نہیں رہے تھے۔

واپسی تو تب کی تھی جب چراغ جلنے لگے۔یوں یہ ننھے مُنے چراغ تو ہمہ وقت ہی جلتے رہتے ہیں پر بڑے چراغ کے گل ہونے پر اِن کی شان اور اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

☆☆☆

سفرِ ازبکستان

باب 1 تاشقند وسط ایشیا کا نگینہ

- **پچاسی سال ماضی کی دوسری سپر پاور سوویت یونین کی غلامی سے آزادی کو عام آدمی نے آغاز میں مشکل سے قبول کیا۔**
- **پرانے وقتوں کی ازبک ماں کا غمگین مجسمہ دوسری جنگ عظیم میں سوویت کیلئے مرنے والے ازبک نوجوانوں کے لیئے ماں کی اداسی کا مظہر تھا۔**
- **ازبک اگر سوفی صد پڑھی لکھی قوم ہے تو اس کا کریڈٹ بھی سوفی صد سوویت یونین کو ہی جاتا ہے۔**
- **ازبکستان میں امیر اور درمیانہ طبقہ موجود ہیں۔غریب یہاں نہیں۔**

جم خانہ کلب کی ہی کوئی تقریب تھی۔ہم چند دوست باتوں اور خوش گپیوں میں مگن تھیں جب دفعتاً کسی ایک نے کہیں چلنے کی بات کی۔دو تین نے فوراً تائید کی۔

''پروگرام بناؤ''

سب نے میری طرف دیکھا۔جواباً میں نے لحہ بھر کی تاخیر کے ایک ہی سانس میں مختلف ملکوں کے نام گنواتے ہوئے گیند اُن کی کورٹ میں پھینک دیا۔

''ہاں تو بولو۔بتاؤ۔فیصلہ کرو۔کہاں جانا چاہتی ہیں؟''

''جہاں چاہو لے چلو۔'' یک زبان سب بولیں۔

’’چاہے جہنم میں۔بس ذرا بجٹ حساب میں رہے۔‘‘

گھر واپس آ کر میں نے کچھ توجہ نہ کی کہ ایسی خواہشوں کا اظہار اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔مگر ہوا یہ کہ جیسے دانہ پانی وسط ایشیاء کے شہروں کا مقدر کر دیا گیا تھا۔

دو تین دن بعد کہیں سیما پیروز اور کہیں شہناز مزمل کے فون کے سلسلوں نے سمجھایا کہ نہیں بھئی یار لوگ بڑی سنجیدہ ہیں اور کہیں بھی نجل ہونے کے لئے تیار ہیں۔

ٹریول بیس انٹرنیشنل کے مسٹر مکرم صاحب سے بات کی۔ چلئے پیکج پر مذاکرات اور دیگر سلسلوں کے بعد ایک دن ہم لینڈنگ کرتے جہاز کی کھڑکی سے نیچے زمین پر بکھرے ازبکستان کے بہت سے دلفریب منظر کھلکھلاتی دھوپ میں نہاتے دیکھ رہے تھے۔وسط ایشیا کے قلب میں بستا یہ قدیم تاریخی ورثے سے مالا مال ازبکستان دریائے آمو اور سیر کے درمیان پستہ قامت پہاڑی سلسلوں تائن شان Tien shan اور آلائی کی ڈھلانوں پر ایک ترتیب وسلیقے سے پھیلا ہوا رنگا رنگ جلوؤں سے سامنے آ رہا تھا۔

میں سحر زدہ سی کہیں دُور ماضی کی فینٹسی Fantasy میں گم تھی۔ مجھے وہ حسین اور افسانوں جیسا رومان رکھنے والی شاہراہ ریشم یاد آئی تھی جو جنوب مشرقی ایشیا اور یوروپ کے ممالک کو ملاتی، اِس مُلک کے بہت سے شہروں کو چھوتی ،اِسے رنگا رنگ ثقافتی اور تہذیبی تحفوں سے نوازتی اور مالا مال کرتی گزرتی تھی اور کل کی طرح آج بھی اسی اہمیت سے قائم ہے۔

جہاز رُک گیا تھا۔سارے مراحل سے گزرتے ہم اِس مُلک کے مرکزی شہر تاشقند کی سرزمین پر کھڑے تھے۔

سچ تو یہ تھا کہ میری آنکھیں اگر جدّت کے رنگوں کو اردگرد بکھرے دیکھتی تھیں تو وہیں میری سماعتوں میں ابھی تک اُونٹوں کے قافلوں کی پُرفسوں سی گھنٹیوں کی آوازیں گونجتی

تھیں۔ آمو دریا کی گنگناہٹوں کا رسیلا سا شور تھا۔ اور کہیں صحرائے تکلا مکان کی وسعتوں کا پھیلاؤ تھا۔

سیما پیروز نے مجھے اس مدہوش خواب سے جھنجھوڑا تھا۔

''کہاں ہو؟ ہوش میں آؤ۔ ابھی سے حواس اُڑا بیٹھی ہو۔''

واقعی میں نے خود کو جھنجھوڑا تھا۔

''تاشقند آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔''

میرے کانوں میں راشد محمود کی آواز گونجی تھی۔ جس نے ہمارا یہ ٹورtourارینجarrange کِیا تھا۔

میں نے گاڑی کے شیشے سے باہر دیکھا تھا۔

کبھی کا سُنا ہوا منظر اپنی پوری تفصیلات سے اُبھر کر سامنے آیا تھا۔

جنوری کا یخ بستہ سا دن، سال 1966 تھا۔ برف جیسی ہواؤں میں برچھی کی سی کاٹ تھی۔ مگر ماحول میں آنے والے مہمانوں اور میزبانوں کی خیرمقدمی مسکراہٹوں کی گرم جوشی تھی۔ یہ جگہ بڑے معزز مہمانوں سے سجی ہوئی تھی۔ اپنے وقت کی دوسری سپر پاور سوویت یونین کا وزیر اعظم کوسیجن اپنے ارکان کے ساتھ مسکراتا نظر آتا تھا۔

میرے ملک کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ "تاشقند معاہدے کی صورت یہاں وقوع پذیر ہونے والا تھا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتی قامت والا وجیہہ جرنیل ایوب خان، وہ منّی سی قامت والا زیرک سیاست دان ہمسائے ملک کا وزیر اعظم لال بہادر شاستری، میرے ملک کا بے حد ہر دل عزیز مگر بدنصیب سیاست دان اور حکمران ذوالفقار علی بھٹو سب مجھے یہاں وہاں بکھرے نظر آئے تھے۔

ایک دوسرے کے ہمسائے پاکستان اور ہندوستان لڑ پڑے تھے۔ دو قدم پرے

رہنے والے روسی رہنماؤں کو خیال آیا تھا کہ بیچ میں پڑے بغیر تعلقات بحال نہیں ہوں گے۔بس تو میلہ کو سچن حکومت نے سجالیا تھا۔

تاشقند کہانی کیا تھی؟اس پر پڑا پردہ اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا۔ہمارا محبوب لیڈر نعرے ضرور لگا تا تھا کہ وہ تاشقند کے اسرار کو بے نقاب کرے گا۔کہیں بعد میں پردے اٹھےاور جانا کہ گھاگ ہندوستانی لیڈر نے تنہائی میں ایوب خان سے خوشامد کرتے ہوئے وہ منوالیا جو وہ منوانا چاہتا تھا۔

اور شاطر کھلاڑی تاریخ ساز شاہ مات دینے کے عین دس گھنٹے بعد جان کی بازی ہار گیا۔ناگہانی موت پر ایک تبصرہ یہ بھی تھا کہ اتنی بڑی خوشی نہ سہار سکا۔

ستر کی دہائی کے آخری سالوں میں میرے ملک کی سڑکیں اِن نعروں سے گونجتی تھیں کہ ہم نے جو کچھ میدان جنگ میں حاصل کیا اُسے تاشقند میں ہار آئے۔اُن نعروں کی پکار اتنی بلند تھی کہ ملک کی تقدیر کا پانسہ پلٹ گیا۔دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت دو ٹکڑے ہوگئی۔ماضی کی تاریخ سے نکل کر اپنے دائیں بائیں نظر ڈالی۔

تاشقند یورپ کے ایک خوبصورت شہر کی مانند نظر آتا ہے۔صفائی ستھرائی،خوبصورت سڑکیں پھولوں پیڑوں سے سجی، اطراف میں بلند و بالا عمارتوں سے گھری ایک دلکش تاثر کو جنم دیتی ہیں۔

سوویت کے زمانے کی بنی ہوئی عمارتوں پر ضرور کہیں کہیں کہنہ سالی کی جھلک ہے تو بھی اُن کی ظاہری صورت کو اچھا اور دیدہ زیب بنانے کی کوشش ضرور نظر آتی ہے۔

تقریباً اسّی 80 پچاسی 85 سال ماضی کی دوسری سپر پاور Super Power سوویت کی غلامی اور کم وبیش نصف صدی زاروں کے چُنگل میں جکڑی اس قوم کے آزاد ہونے والے مُلک کے بارے میں بھی بہت سے سوالات ذہن میں کلبلاتے

تھے۔ جی چاہ رہا تھا گاڑی چلانے والے ڈرائیور کو جو ازبک تھا ابھی سوالوں کے نرغے میں لے لوں۔ مگر رُک گئی۔ خود کو کوسا۔ صبر سے چل۔ سکون لے۔ کوئی باز و بیلنے میں آ گیا ہے۔

ازبکستان ہوٹل میں قیام تھا جو آزادی چوک میں واقع ہے۔ شاندار اور فائیو سٹار جیسا۔ شام کو مستقلک Mustakillik (آزادی چوک) میں یادگاریں دکھانے والی گائیڈ آیانا نے جو بمشکل بائیس 22 تیئس 23 کی ہوگی ہمیں بہت سے سوالوں کے جواب ہمارے پوچھے بغیر ہی تفصیلات بتاتے ہوئے دے دیئے تھے۔

اُس نے کہا تھا اِس چوک کا یہ نیا نام اور اس میں تعمیر چیزیں اپنے سٹائل کے اعتبار سے منفرد ہی نہیں بلکہ یہ ہماری رہائی، ہماری آزادی، ہمارے نئے خوابوں اور ہماری آرزوؤں کی جگہ ہے۔

آیانا کا لہجہ کیسا جوشیلا سا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔

آزادی چوک میں داخلے سے قبل امیر تیمور کی یادگار پر تصویر کشی ہوئی تھی۔ امیر تیمور ازبک لوگوں کا ہیرو جس کی سلطنت کی وسعت اور جہانبانی کے انداز پر ہر ازبک نازاں ہے۔

آیانا ہمیں اُزگلک Uzgulik آراشی محرابیں جن پر بگلا اُونچی اُڑان کیلئے پر تولتا ہے کے نیچے سے گزارتی اُن یادگاروں کے پاس لے آئی تھی جو نئے مُلک کیلئے بہترین اور بلند آرزوؤں کی نمائندہ سمبل symbol تھیں۔

1991ء میں آزادی کی یادگار گرینائٹ چبوترے کی چوٹی پر دھرا وہ بڑا سنہری گلوب globe ہے جس پر کبھی لینن براجمان تھا۔ انقلابی بیٹھے تھے۔

آزادی کے پہلے ہلّے ہی میں لینن کے مجسمے کو اُتار دیا گیا۔ گلوب پر کندہ باڈر لائن دُنیا میں آزاد ازبک سٹیٹ کو ظاہر کرتی ہے۔ نیچے ہیپی مدر Happy mother کا مجسمہ

بچے کو گود میں لیئے کھڑا ہے۔ یہی مدر ازبک دھرتی کا سمبل اور گود میں بچہ اس کی نئی نسل کا مستقبل۔

نوجوان لڑکی کی آواز میں اپنی آزادی کے حوالے سے جس جوش وجذبے کا اظہار تھا وہ ہمیں بہت کچھ بتا اور سمجھا رہا تھا۔

ذرا فاصلے پر Sad mother غمگین ماں کا مجسمہ تھا۔ پرانے وقتوں کی ازبک ماں جس کے جوان بچے دوسری جنگ عظیم میں بھینٹ چڑھے۔ ''یہ جنگ ہماری دھرتی کیلئے نہیں تھی۔ یہ سوویت کیلئے تھی۔ اُس کی عظمت اور کامرانیوں کیلئے کہ ہم غلام تھے۔''

آیانا کے لہجے میں ایک آزاد مُلک کی شہری ہونے کے ناطے اپنے مُلک کے ماضی کے حوالے سے کسی احساس کمتری کے بغیر جو دُکھ اور تاسف تھا وہ یقیناً قابل فخر تھا کہ ہم ابھی تک اِس جذبے سے آشنا نہیں ہو سکے ہیں۔

شہر کے گرد گھومتے پھرتے ہم نے سُنا ازبکستان ایک ملٹی نیشنل مُلک ہے جہاں ازبک، قازق، تاجک، کرغیزی، ترکمانی، تاتار، روسی، یوکرینین، بیلوروسی، کورین رہتے ہیں۔ 24 ملین آبادی والے مُلک میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ روسی آرتھوڈوکس، عیسائی، یہودی اور چند دیگر اقلیتیں بھی ہیں۔ ریاست خود کو اسلامی سٹیٹ نہیں کہلواتی۔ مذہب لوگوں کا ذاتی عمل ہے۔

دفتروں، ہوٹلوں، کاروباری اداروں، دوکانوں، ریستورانوں اور فٹ پاتھوں پر چیزیں بیچتی ازبک عورت بڑی جی دار اور ذمہ دار نظر آتی ہے۔ نوجوان لڑکی حسین بھی ہے اور جلدی قابو میں آنے والی بھی۔ پاکستانی اور انڈین نوجوانوں کی اکثریت کاروبار کے ساتھ ساتھ دل پشوری کیلئے بھی یہاں کا رُخ کرتی ہے اور اکثر غلط حرکات کا باعث بنتی ہے۔ انڈینز Indians کے تو ویزہ Viza پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔

اِس مسئلے نے بڑی سنجیدگی اختیار کرلی تھی۔حکومت نے مداخلت کرنی ضروری سمجھی تھی۔ بہت سے اصلاحی اقدامات اور قوانین بنائے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ کوئی غیر مُلکی کِسی مقامی لڑکی کو لے کر ہوٹل کے کمرے میں نہیں جاسکتا۔تاہم انڈین حکومت کی یقین دہانی پر اِس پابندی کو گذشتہ ماہ نرم کِیا گیا۔

رات Sim Sim میں ڈنر تھا۔

باہر سے ماڈرن modern پر اندر سے اپنے قدیمی رنگ میں رنگا چوبی کندہ کاری سے گُھتا دیکھنے میں خوبصورت نظر آیا۔مزے کی جو چیز دیکھنے کوملی وہ پیشہ ور رقصاؤں کے عریاں ناچ کے ساتھ ساتھ مقامی خاندان کی فیمیلوں کا بمعہ نوجوان لڑکیوں کے اُٹھ اُٹھ کر رقص میں شامل ہونا تھا۔گو یہ رقص بازو اور کولہے ہلانے پر ہی تھا۔بس کم وبیش یہی رقص کا انداز ہمیں ہر جگہ نظر آیا۔

ہم ہندوستان اور پاکستان کے لوگ کلاسیکل رقص کے جن رنگوں سے آشنا ہیں وہ تو پتہ پانی کر دیتے ہیں۔ہاں مگر مقامی لوگوں کا کہنا تھا اور وہ بھی ازبک مردوں کا کہ ازبک قومی موسیقی اور اِس کے رقص، اِس کے ساز اور گیت دوگروپوں میں منقسم ہیں۔پہلی قسم میں یہ طے ہوتا ہے کہ کِسی مخصوص وقت اور مخصوص حالات میں رقص وموسیقی کیسی ہوگی؟

دوسری قسم ہمہ وقت موسیقی کی ہے یعنی میرے خیال میں اُٹھو اور تھرکنا شروع کردو۔ازبک ڈانس میں حرکات کی اثر پذیری بہت ملائمت اور سیدھی سادی ہے۔سیدھے سادھے قدم جو کبھی دائروں میں اور کبھی دائروں سے باہر ہوں اور واقعی اس کا مظاہرہ ہم نے خوب دیکھا اور لُطف اُٹھایا۔

کھانا بھی بڑا مزے کا تھا۔پہلے ٹماٹر کھیرے آئے۔آدھ گھنٹے بعد پیاز آیا۔پورے پون گھنٹے بعد ازبک نان آیا اور پھر کہیں جا کر کباب اور تکّے آئے۔ چربی کے

روغن میں تلے ہوئے۔بس اب کھانے کتنے تھے۔یونہی منہ ماری کی۔

چِروک پستہ قامت پہاڑیوں میں گھرا وسیع وعریض مصنوعی جھیل سے سجا ڈھلانی چھتوں اور پھلدار درختوں سے سجے صحنوں،صاف ستھری گلیوں والا قصبہ ہے۔پہاڑیوں کے درمیان نیلی وسیع وعریض جھیل کے کناروں پر نمدے کے شیڈوں تلے خاندان بوٹنگ کرتے اور موج مستی میں مگن تھے۔

یہاں ہم نے درختوں تلے بیٹھ کر ازبک پلاؤ کھایا۔نان کھایا قہوہ پیا اور لوگوں سے باتیں کیں۔ہمارا ڈرائیور تو بہت اچھی انگریزی بولتا تھا۔

اُس نے میرے سوال کے جواب میں کہ سوویت سے الگ ہو کر کیسا محسوس ہوتا ہے؟ بتایا کہ آغاز مشکل تھا کہ تنخواہیں لگی بندھی اور سہولیات کے بہت عادی تھے۔گھبراہٹ اور افراتفری تھی مگر اب سنبھل گئے ہیں اور بہت خوش ہیں۔چھوٹے بڑے ذاتی کاروباروں کا بھی آغاز ہے۔ہمارے ہاں امیر اور درمیانہ طبقہ ہے۔غریب یہاں نہیں۔

سعید ٹھیک کہتا تھا کہ ہفتہ بھر کے قیام میں ہم نے صرف ایک خاتون کو مانگتے ہوئے دیکھا۔

دریا کے پار سڑک کے کنارے پھل بیچتی عورتیں کتنی پُر اعتماد تھیں۔

ازبک کرنسی سوم (Soum) ہے ایک ڈالر 2800 کا ہے۔سو ڈالر بھناؤ تو بیگ گلے گلے تک آجاتا ہے۔4 کیلے ہاتھ بھر لمبے 17000 کے۔انگور آدھا کلو اور آڑو کلو 37000 ہزار کے۔پچاس ہزار کا تو چٹکی بجاتے صفایا ہوا تھا۔

سعید دلچسپ نوجوان تھا۔تاریخ سے دلچسپی رکھتا تھا۔شہر میں گھماتے پھراتے اور بتاتے ہوئے تھکتا نہ تھا۔

شہر انتظامی لحاظ سے 12 حصّوں یا ازبکوں کے مطابق 12 ضلعوں میں منقسم

ہے۔ان ضلعوں کے نام کچھ تو مانوس سے لگے۔دراصل 1866ء میں روسی تسلط میں آجانے کے بعد روسی زبان کا اثر اور رسم الخط کی تبدیلی دونوں زبان اور کلچر پر اثر انداز ہوئیں۔ازبک زبان کا ماخذ ترکی زبان ہے۔کچھ اثر فارسی کا بھی ہے۔

آزادی چوک عین مرکزی جگہ ہے جہاں سے فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی طرح تاشقند کی ہر سمت کشادہ اور خوبصورت سڑکیں نکلتی ہیں۔

سڑکیں ماضی اور حال کی نامور شخصیات کے ناموں پر ہیں۔امیر تیمور، روسی عظیم شاعر پشکن اور عظیم ازبک شاعر علی شیر نوائی کے ناموں کی حامل مرکزی شاہرائیں اپنی کشادگی، سبزے اور خوبصورتی میں بے مثال ہیں۔

تاشقند بزنس سنٹر، ٹی وی ٹاور اور سینٹرل بینک جیسی شاندار اور گرانڈیل عمارتیں ہم نے سعید کی نشان دہی پر دیکھیں۔دراصل سڑک پر کھڑی ہر دوسری عمارت شاندار اور پُروقار تھی۔

1966ء اپریل کے مہینے میں تاشقند ایک مہیب زلزلے سے دوچار ہوا۔پرانا حصّہ جہاں ازبک لوگوں کی اکثریت تھی زمین بوس ہوگیا۔سوویت کی ریپبلکوں اور فن لینڈ Finland کی فوری دلچسپی نے تاشقند کو ایک نیا اور جدید شہر بنا کر رکھ دیا۔

پرانا اور قدیمی حصّہ جسے کِسی بھی شہر کا ڈاؤن ٹاؤن Down Town کہتے ہیں تاشقند میں نہیں ہے۔سعید سے ہمارا اصرار پرانے شہر لے کر چلو۔گاڑی جدید سڑکوں پر گھومتی رہتی اور سعید کہتا۔

تاشقند کی وہ تنگ تنگ خمدار گلیاں بے کھڑکیوں والے کچے پکے چھوٹے چھوٹے گھر جن کی دیواریں انگوروں کی بیلوں سے ڈھنپی ہوتی تھیں اور پرشور بازار۔زلزلے نے سب کچھ ملیامیٹ کر دیا۔اب سب کچھ ماڈرن ہے۔یہ سب بخارا اور سمرقند کے قدیمی حصّے

میں نظر آئے گا۔

اور جب ہم ڈاکٹر اور پروفیسر زُلفیہ کے سونے رنگے مجسمے پر تصویریں اُتر واتے تھے ہم نے اِس عظیم ازبک خاتون کے بارے میں جانا۔ بہت سی سائنسی کتابوں کی مصنف تاشقند کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ Institute کے کلینک کی سربراہ ازبک عورتوں میں بیداری پیدا کرنے والی ڈاکٹر زلفیہ رول ماڈل Role Model ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ آج اگر ہم سو فیصد 100% پڑھی لکھی قوم ہیں تو بہر حال اس کا کریڈٹ ہمیں روس کو دینا ہے۔

سعید ہمیں ڈاکٹر زلفیہ سے متعارف کرواتے ہوئے بولا تھا۔ اکتوبر انقلاب سے پہلے ازبک صرف دو فی صد پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ تعلیم صرف ملاؤں ،زمینداروں اور خوانین کے بچوں کو نصیب تھی لیکن انہوں نے سکول کھولے۔ امیر غریب سب کیلئے اِسے لازمی کِیا۔ نصاب ایک ہوا۔ کالج اور یونیورسٹیاں بنائیں۔

سوویت کا ازبک عورت پر یہ بھی احسان ہے کہ اُس نے ازبک عورت کو گھر سے باہر نکالا۔ عورتوں کے تو کوئی حقوق ہی نہیں تھے۔ اُن کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ وہ اپنے شوہروں کا بچا کچھا کھاتی تھیں۔ باہر جاتے ہوئے انہیں اپنا چہرہ گھوڑے کے سیاہ بالوں کی نقاب سے چھپانا پڑتا تھا جو چاچوان کہلاتی تھی۔

سوویت دور میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوئے۔ لڑکیوں کی خرید وفروخت اور کئی بیویوں پر پابندی لگی۔ عورت ہر شعبے میں آگے بڑھی۔ ہماری ایک رول ماڈل Role Model ترسونوئی اخونووا نے بھی عورتوں کی بیداری کیلئے بہت کام کِیا۔ وہ تاشقند میں پنچائتی فارم میں کام کرنے والے جتھوں کی سربراہ کے طور پر مشہور ہوئیں۔

ازبکستان کپاس پیدا کرنے میں دُنیا بھر میں چوتھے نمبر پر ہے۔ کھیتوں سے لے

کر روئی پہنچنے اور مشینوں تک لے جانے میں انہوں نے ہر مرحلے کو مشینوں کے ذریعے کرنے اور کروانے پر زور دیا اور عملی طور پر کر کے دکھایا۔

ڈاکٹر خدیجہ سلیمانوا ایک اور قانون کی ڈاکٹر۔ازبکستان کی پہلی سائنس اکیڈمی کی ممبر منصودہ حوجنیوا تھیں۔یہ ہماری پرانی رول ماڈل خواتین تھیں جو ہمارے لیئے مشعل راہ ہیں۔

ازبکستان میں اس وقت بیس ہزار سے زیادہ ڈاکٹرز، انجینئرز، جانوروں کی ڈاکٹر اور ایگریکلچرل ڈاکٹرز Agricultural Doctors ہیں۔صحت کے شعبے میں بھی ہم ترقی یافتہ ممالک سے کسی طور پیچھے نہیں۔ پہلے ازبکستان میں صرف 80 ڈاکٹرز تھے۔اب چالیس ہزار ڈاکٹرز ہیں۔فی ہزار آبادی کے لحاظ سے طبّی کارکنوں میں ازبکستان برطانیہ اور فرانس جیسے مُلکوں سے آگے نکل گیا ہے۔ پہلے علاج مفت ہوتا تھا۔اب تھوڑے سے چارجز ہیں۔

سکولوں میں سیکنڈری لیول تک تعلیم مفت اور یکساں ہے۔ایک نظام تعلیم۔اس وقت صرف تاشقند میں چھ یونیورسٹیاں ہیں۔''ہائے'' میں نے کتنی لمبی سانس بھری تھی۔کتنی آہیں اور حسرتیں تھیں اُس میں۔

صفائی ستھرائی کا نظام بھی قابل رشک ہے۔تفصیلات سے جو تصور کھینچی وہ اتنی سادہ، کارآمد اور فوری قابل عمل کہ جس کے لیئے کہا جائے کہ ہل گھوڑے جوتنے کا تردد ہی نہیں۔کسی ملک سے کوئی مدد یا کسی بھی طرح کی کوئی ٹیکنالوجی بھی نہیں مانگی۔

سچ تو یہ تھا کہ جب میں یہ سب سنتی تھی میرا سر شرم سے جھکا جاتا تھا۔کلیجے سے آہیں نکلتی تھیں۔پروردگار ہم اتنے لنگے لولے ہیں کہ ہم سے اپنا گند بھی اٹھایا نہیں جاتا۔اس کا ٹھیکہ ترکی کو دے دیا ہے۔ مجھے یاد ہے ہمارے بچپن میں صفائی کا ایسا اچھا انتظام تھا کہ

گلیوں میں بہتی نالیوں میں روز چونا پھینکا جاتا اور ماشکی پانی پھینکتا۔

ازبک حکومت نے چھوٹے بڑے شہروں میں ہر سو میٹر پر ایک کوڑا اسٹاپ بنا دیا ہے۔سبز رنگ کے اِس کوڑے دان میں تین دھاتی کوڑے دان رکھے گئے ہیں۔چھت بھی ہے کہ بارش میں کوڑا گیلا ہو کر تعفن کا باعث نہ بنے۔پھر ہر گھر، ہر دکان، آفس سب کو لازمی کہا گیا کہ ان کے دروازوں پر ان کے اپنے کوڑے دان ہوں۔تا کہ وہاں صفائی کرنے والیاں سارا کوڑا اپنے کوڑا دان میں ڈال دیا کریں۔ساتھ ہی ہر محلے میں متعدد کوڑا گھر ہیں۔ایک چار دیواری بنائی گئی ہے جس کے چاروں طرف پھولدار پودے بھی لگائے گئے ہیں۔یقیناً اس سے ماحول کو خوشگواری فراہم کرنا مقصود ہے۔اندر متعدد کوڑے دان اس طرح رکھے جاتے ہیں کہ شیشے، دھات، کپڑے، خوراک کی اشیاء کے لئے علیحدہ علیحدہ ڈھکے ڈرمز موجود ہیں۔

ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا گیا ہے جہاں باقاعدہ ایک ملازم چوبیس گھنٹے موجود ہوتا ہے۔اس کا کام اول تو کوڑا گھر میں صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا کہ وہاں کوئی گندگی یا بدبو نہ پیدا ہو۔دوسرا محلے کے افراد جب کوڑا لاتے ہیں تو ان کو باقاعدہ گائیڈ کرنا ہوتا ہے کہ وہ کونسا کوڑا کون سے ڈسٹ بن میں پھینکیں۔جب گاڑی کوڑا جمع کرنے آتی ہے تو وہ گاڑی والوں کی مدد کرتا ہے اور اس کی ذمہ داری ہے کہ سارا کوڑا گاڑی کے حوالے کرے اور نئے ڈسٹ بن وصول کر کے اپنی اصل جگہوں پر فکس کر دے۔غرض کہ یہ کوڑا گھر کسی عظیم ٹیکنالوجی کی مرہون منت نہیں۔بلکہ صرف اور صرف خلوص نیت اور ملک سے محبت کا نتیجہ ہے۔یوں کہنے کو صفائی نصف ایمان ہے۔ہمارے ایمان کے اِس حصّے کی دھجیاں کیسے بکھرتی ہیں ہمارے کوچہ و بازار گواہ ہیں۔خدا ہمیں ہدایت دے۔

چار سو تاشقند کا قدیمی بازار ہے مگر بہت ماڈرن بازار ہے۔ٹکڑوں میں بٹا اُونچی

نیچی ڈھلانوں پر بکھرا ہوا۔ روسی عورتوں کی طرح ازبک دکاندار عورت بھی انتہائی چست اور ہوشیار ہے۔ بازار تو عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ سبزی کی دوکانوں پر سیڑھیوں جیسے زینوں پر سجی سبزیوں کی قطاریں، ڈرائی فروٹ Dry Fruit کی پوری منڈی۔

بہت سارے زینوں کی چڑھائی کے بعد اوپر گئے۔ بادام کی کوئی پندرہ قسمیں تو ہوں گی۔ کالی کشمش کتنی لذیز تھی۔ جتنی مرضی چکھو، چکھتے جاؤ اور بھاؤ پوچھتے جاؤ۔ خوبانی سوکھی ایسی میٹھی اور ذائقے والی۔ کیا کچھ نہیں تھا وہاں۔

ہینڈی کرافٹ Handicraft کی دوکانیں رنگین نقش و نگاری سے سجی ہوئیں۔ جی چاہے سب کچھ خرید لو پر ٹوٹنے کا ڈر ہاتھ روکتا تھا۔ سمرقند اور بخارا کے قالین، گل دان اور پیتل کی آرائشی چیزیں۔ کڑھائی والے پہناوے، سلک کے سکارف اور سٹول۔ ایک دھوپ کی تمازت اوپر سے مہنگے داموں کی تمازت۔

میرے پاس روبل بھی تھے۔ بدلوائے تو حیران ہوئی۔ 500 کے صرف 40000 ہزار ملے۔ اب کیا معلوم۔ کتنی ہیرا پھیری ہوئی۔ بلیک مارکیٹ تو وہاں بھی خیر سے زوروں پر ہے۔

پرانے شہر کی جھلکیاں تو اُن بڑی بڑی پینٹنگز paintings میں نظر آئیں جو مارکیٹوں میں لاکھوں صوم کے عوض بکتی تھیں پر وسط ایشیا کا یہ عظیم شہر اپنے مدرسوں، مسجدوں، خانقاہوں کے حوالوں سے جس تاریخ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے وہ بڑی دلفریب ہے۔

مارکیٹ کے پاس ہی مشہور جمعہ مسجد تھی۔ صدیوں پرانی یہ مسجد بھی دیکھنے کے قابل تھی۔ سولہوں سے بیسویں صدی تک کئی بار اس کی مرمت اور آرائش ہوئی۔

Telyashayakh میں ہم نے اُس ابتدائی قرآن مجید کو دیکھا جو دُنیا کا نادر

نسخہ ہے اور جس کی حضرت عثمانؓ اپنی شہادت کے وقت تلاوت کر رہے تھے۔ اُس کے وہ اوراق جن پر خون گرا تھا ہم نے دیکھے۔

اسے امیر تیمور سمرقند لایا تھا۔ روسی اِسے لے گئے تھے۔ پیٹرز برگ کے میوزیم میں تھا۔ 1924ء میں واپس دیا گیا۔ کوفی رسم الخط کے نسخے بھی تھے۔

دھوپ اتنی شدید تھی۔ تصویروں کی اجازت نہیں تھی۔ پانی بھی نایاب تھا۔ باہر بھاگے۔ گاڑی میں رکھی بوتلیں اُبل رہی تھیں۔ چلو گرم پانی پیٹ کیلئے بہت اچھا ہے۔ چینی تو پیتے ہی گرم پانی ہیں۔ دل کو بہلاتے اسے ہونٹوں سے لگایا۔

مدرسہ عبدالقاسم شیخ بھی دیکھنے کی چیز تھی۔ موجودہ پارلیمنٹ کی بلڈنگ اور چودھویں صدی کے عظیم شاعر، سائنسدان، سیاست دان مصوّر علی شیر نوائی کی یادگار نوائی نیشنل پارک کے پاس ہے۔

تاشقند کے جنوب مشرق میں تعمیری شاہکار زنگی عطا Zanghi ata کو دیکھنا اور عطا گاؤں میں جانے کا تجربہ بہت دلچسپ تھا۔ یہ ایک قدیم قبرستان کی حدود میں تعمیراتی شاہکار تھا جو اپنی کہنہ سالی کے باوجود اپنی شاندار عظمت کے ساتھ کھڑا ہے۔ یہ شیخ عطا خواجہ کی یاد میں بنائی گئی یادگار ہے جو ایک عرب قبیلے سے تھا۔

گہری آبنوسی رنگت والا زنگی عطا اُس صوفی روایت کا جانشین جو سلسلہ Yassaviya سے تھا۔ زنگی عطا نے ایک ایسے وقت جب منگول غلبے کا زور تھا اور اسلام تنزلی کی طرف مائل تھا۔ اسلامی روایات اور اس کی تعلیمات کا ازسرِنو احیاء کیا۔

قریب ہی اُن کی اہلیہ عنبر بی بی کا مزار ہے۔ صحن کے اطراف میں مدرسہ کی عمارت اور مینار ہے۔ عظمت رفتہ کے نشان جس میں اُن خوشبوؤں کی مہک ہے جو ہمارا تہذیبی اثاثہ ہے۔

امیر تیمور کے نام کا حامل سٹیٹ میوزیم وہیں یادگاروں کے پاس ہی ہے۔ بہت خوبصورت اور دیدہ زیب عمارت۔ٹکٹ چار ہزار صوم تصویروں کی مناہی۔ میوزیم بہت بڑا نہیں تھا۔تعارفی ہال کا بنیادی مقصد تیمور کی عظمتوں کو خراج پیش کرنا ہے۔اُس کی سلطنت کی حدود اُس کی انتظامی صلاحیتیں سب تصویروں اور نقشوں کی صورت دیواروں پر آویزاں تھیں۔

تاریخ سے خصوصی رغبت رکھتے ہوئے بھی مجھے تیمور کی سلطنت کی بے پایاں وسعتوں کا اتنا اندازہ نہ تھا۔نقشوں سے آگاہی ہوئی تو حیرت زدہ رہ گئی۔

مجھے اس میوزیم کا سب سے دلچسپ حصّہ وہ لگا جس میں ازبک قوم نے اپنے ہیرو کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ یہ تقریباً دو سکوائر میٹر پر محیط ایریا جس میں پیدائش اُس کا عروج اور اس کا فخر و ناز سے بھرا اثاثہ دیوار پر تصویری نقش گری کی صورت موجود تھا۔

اس قدیم تہذیب کی جھلکیاں دیوار پر بکھری ہوئی تھیں۔جس پر وسط ایشیا ہمیشہ سے نازاں رہا۔عورتوں کا ایک ٹولہ بیشک (جھولے) کے پردوں پر کشیدکاری کرتے ہوئے گیت گاتا تھا۔خواتین کے چہروں کی خوبصورتی، ان کے زیورات، سروں پر رکھی موتیوں اور میناکاری سے سجی ٹوپیاں، ان کے کشیدہ کاری سے سجے لباس کیا منظر تھا۔پس منظر بھی کمال کی خوبصورتی لیئے ہوئے تھا۔

اپریل امیر تیمور کی پیدائش کا مہینہ درختوں پر پھوٹتے شگوفوں کا خوشی کے اظہار سے تھا۔

ازبکستان میں ایک رواج ہے کہ بیٹے کی پیدائش پر پاپلر لگایا جاتا ہے۔باز کی موجودگی اور اس کی اُڑان جنگ جیسے افسانوی خیال کا عکاس اور خوش نصیبی کے پرندے ''ھما'' کا نوزائیدہ بچے کو اپنی کتاب دینا یہ سب دیکھنا اور تاریخ میں جھانکنا یقیناً بہت

لُطف دینے والا عمل تھا۔ بہت مزہ آیا۔گائیڈ سعید نے اِسے جس انداز میں بتایا وہ بھی دلچسپ تھا۔بقیہ میوزیم میں نے دیکھا مگر سرسری سی نظر سے۔

ہاں الغ بیگ کی رصدگاہ کے پاس تصاویر بنوائیں۔کپڑے،زیورات،ظروف سبھی اچھے تھے پر امیر تیمور کی تصویریں بہت دھیان سے دیکھی گئیں۔

اگرچہ ازبک سرکاری زبان ہے تاہم روسی مقامی زبان ہے۔گورنمنٹ فارم،مختلف اداروں کی رپورٹیں،ایرپورٹ پر چھپے ہوئے فارم اور بہت سا دوسرا مواد روسی زبان میں ہی ہے۔اب ازبک لوگوں نے روسی حروف تہجی (cyrillic) سریلک کی بجائے Latin استعمال کرنے شروع کردیئے۔پاکستانی بزنس مین جناب اقبال احمد کا کہنا تھا کہ اس سے ابھی کنفیوشن confusion پیدا ہورہی ہے۔کچھ عرصے بعد بہتری کی اُمید ہے۔

ازبک محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ہمیں انڈین جان کر نمستے سے آغاز کرنے والے مردوں،لڑکوں،لڑکیوں،عورتوں کو جونہی پتہ چلتا کہ ہم پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں تو بے اختیار اُن کی زبانوں پر الحمداللہ کے الفاظ تھرکتے۔میٹھی سی مسکراہٹ آنکھوں اور چہروں پر پھیلتی جو یہ بتاتی کہ اُن کے جذبے ڈیڑھ صدی کے دباؤ کے باوجود ابھی بھی اُس لافانی رشتے سے بندھے ہوئے ہیں جو ہمیں ملت اسلامیہ کی زنجیر میں پروئے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

علی شیر نوائی

- علی شیر نوائی وسط ایشیا کے ترک لوگوں کا محبوب شاعر ہے۔
- ادب اور فنون لطیفہ کی بے شمار جہات کا مالک نوائی نے مجرد زندگی گزاری اور خود کو علم و ادب کے لئے مخصوص رکھا۔
- تیس سال میں تیس والیوم کا کام جس میں چغتائی ترکی، فارسی اور عربی کا کام شامل ہیں۔

''علی شیر نوائی ہمارا قومی شاعر۔''

تاشقند کی اِس میٹھی سی دھوپ میں یہ سنتے اور نوائی کے چمکتے مجسمے پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں نے قدرے تعجب سے اپنی گائیڈ آریانا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے تمہارا شاعر کیسے ہوگیا۔ یہ تو افغانستان کے مغربی شہر ہرات جیسی تہذیبی اور علمی جگہ کی جم پل اور وہیں دفن بھی ہے۔''

نوجوان آریانا نے فخر و غرور سے پُر لہجے میں تُرت جواب دیا تھا۔

''ہرات ہمارا ہی تو حصہ تھا۔ ہمارے تیمور جیسے عظیم شہنشاہ کے دور میں اور نوائی اُسی دور کا ہیرا ہے۔''

''اوہ''

کہتے ہوئے مجھے اپنی کم علمی پر افسوس ہوا۔ البتہ پھر یہ ضرور ہوا کہ اپنے اِس سیر

سپاٹے اور تاشقند یونیورسٹی میں شعبہ اورینٹیل سٹڈیز میں گھومتے پھرتے کتابیں دیکھتے پھرولتے شاعر میری ترجیحات میں رہا۔

تو9 فروری 1441ء میں ایک ارسٹوکریٹک فوجی خاندان میں پیدا ہونے والا یہ علی شیر نظام الدین علی شیر ہروائی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔تعلیمی سلسلہ زیادہ ہرات، مشہد اور سمرقند میں ہوا۔ یہ شخصیت ادب اور فنونِ لطیفہ کی چند ایک نہیں بلکہ بے شمار جہتوں سے نہ صرف وابستہ بلکہ اُن میں کمالِ فن کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔کہیں اعلیٰ پایہ کا مصور، کہیں سیاست دان، کہیں ماہرِ تعمیرات ۔ان سب کے ساتھ شاعری کے والیوم۔ اِس سلسلے میں وہ دانتے Chaucer(قرونِ وسطیٰ کا انگلش شاعر) اور Galoardsجیفرے (لاطینی شاعر) کی طرح کا ہی تھا۔یعنی وسطِ ایشیا کا یہ عظیم انسان بیک وقت شاعر، ادیب، مترجم، سیاست دان، ماہرلسانیات، ماہرِ تعمیرات اور صوفی جو اپنی روایات سے جڑا ہوا تھا۔ کتنے روپ تھے اِس نوائی کے۔اگرچہ وہ رومی کے کوئی 250 سال بعد پیدا ہوا۔

اس وقت کا ہرات علم وادب کا گہوارہ، اسلامی تہذیب وثقافت کا مرکز گردانا جاتا تھا۔شہنشاہ تیمور بذات خود علم وفن سے بہرہ ور اور اس کا بانی وسرپرست تھا۔علی شیر خود چغتائی امر(جنہیں فارسی میں میر کہا جاتا تھا) سے تعلق رکھتا تھا جو اُس وقت کی سوسائٹی کی ایلیٹ کلاس تھی۔باپ غیاث الدین کچکینا kichkina خراسان کے حکمران شاہ رخ مرزا کے محل کا افسر اعلیٰ تھا۔ ماں بھی محل میں شہزادے کی گورنس تھی۔خاندان تیمور شہنشاہ کے بہت قریب تھا۔اپنے پہلے ٹرکش دیوان کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے۔

میرا باپ تو محل باڑی کی مٹی جھاڑتا تھا　　ماں وہاں خادمہ تھی
خود میں اُس درباری باغ کی بلبل یا کوّا　　اس باغ سے باہر جو کچھ بھی ہوتا

میری روح جدائی کی ٹیسوں سے بے حال رہتی

عظیم تاریخ دان Hondamir کے مطابق عہد ساز شاعر لطفی نے اس کے بچپن میں اُسے دیکھا۔ بات چیت کی اور کہا۔

''بہت فطین بچہ ہے۔ ناموری کے اوج پر پہنچے گا۔''

1447ء میں خاندان کو ہرات سے بھاگنا پڑا کہ شاہ رخ کی موت نے خراسان میں ابتری کی صورت کو جنم دیا تھا۔ تعلیمی سلسلہ مشہد اور سمرقند سے جڑ گیا تھا۔ علی شیر نوائی کی زندگی سادہ بے حد مذہبی اور مجرد قسم کی تھی۔ شادی نہیں کی۔ ملازمت کا جہاں تک تعلق ہے خراسان کے سلطان کے منتظم اور مشیر اعلیٰ تھے۔ ماہر تعمیرات بھی ہونے کی وجہ سے تعلیمی درسگاہیں، مسجدیں، خانقاہیں، سرائے، پل، حمام غرض کہ بہت کچھ تعمیر کروایا۔ ان میں سب سے اہم صوفی شاعر فریدالدین عطار نیشاپور کا مقبرہ ہے اور ہرات کا مشہور مدرسہ۔ تعمیرات، ادب، شاعری اور دیگر بے شمار حوالوں سے اِس عہد کو تیمور کا دورِ نشاۃ ثانیہ کہا جا سکتا ہے۔

نوائی ترکی زبان کا بہت بڑا مدّاح تھا۔ آغاز کا کچھ کام پرانی ازبک زبان میں ہے۔ مغرب میں اِسے چغتائی لٹریچر کہا جاتا ہے۔

وہ اسے فارسی زبان پر فوقیت دیتا اور مقابلتاً افضل گردانتا تھا اور اِس بارے وہ بڑا واضح اور دوٹوک تھا۔ شاعری کو اِس نے اپنی مقامی زبان میں کرنے کو ترجیح دی۔ شاید کہیں اس کی دلی محبت کا جھکاؤ بھی یہاں شامل تھا۔ اس نے اِسے اپنے کام سے ثابت بھی کیا۔ جب لکھنا شروع کیا تو قلمی نام نوائی رکھا۔ علی شیر نوائی نے ترک زبانوں میں انقلابی سطح کا کام کیا۔ تیس سالوں میں تقریباً تیس والیوم کا کام جس نے چغتائی زبان کو محترم و معزز بنا دیا۔ بہت سا کام فارسی میں بھی ہے۔ یہاں قلمی نام فینی تھا۔ عربی میں البتہ قدرے کم ہے۔ اِس منفرد چغتائی زبان میں شاعری کرنے کی وجہ سے ترکی بولنے والی پوری دنیا میں وہ

ترک لٹریچر کے اولین بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔

نظموں میں بہترین کام زیادہ تر چار دیوانوں میں موجود ہے۔ بہت سا کام شاعری کے مجموعوں میں بھی پایا جاتا ہے جو تقریباً 5000 اشعار پر مشتمل ہے۔ شاعری کی انفرادیت کا اندازہ اِس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس کے کام کا ہر حصّہ زندگی کے مختلف حصّوں کا منفرد انداز میں ترجمان ہے۔

اِن نظموں کی ایک اور نمایاں خوبی غزل کی ساخت ہے۔ قدیم عربی شاعری کے انداز و اطوار کے ساتھ غزل خراسان اور وسط ایشیا میں پھیلتی چلی گئی۔ جس پر صوفیانہ رنگ ڈھنگ اثر انداز ہوتا گیا۔ اس کی ساخت کے ڈھانچے میں وہی مخصوص محبت اور جدائی کا رنگ غالب رہا۔

استنبول کی سلیمان ذی شان لائبریری میں نوائی کے مندرجہ ذیل دیوان موجود ہیں۔

1۔ غاراب الصغیر (بچپن کے اسرار) 2۔ نوادرال شباب (جوانی کی ندرتیں)

3۔ بدی ال وسط (اُدھیڑ عمری کے معجزے) 4۔ فوائد الکبیر (بڑھاپے کے فوائد)

اس کا پہلا چغتائی ترک دیوان غاراب الصغیر بہت ساری وجوہات کی بنا پر بہت دلچسپ ہے۔ اس کا دیباچہ ہی اندر کی ساری کہانی کھول دیتا ہے۔

جوانی کے جوشیلے جذبوں کا پاگل پن جس نے شاعر کو سنجیدہ مطالعے، موسیقی اور شراب سبھوں سے قدرے دور کر دیا تھا۔ اس کا اظہار احمد عبداللہ حجازی کی سوانح حیات کے خاکے میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سلطان حسین کے لئے شکر گزاری کے گہرے جذبات کہ جو کردار سلطان نے اپنے وقت میں علم وفنون کو عروج دینے اور اس کی شاعری کو سنوارنے میں ادا کیا وہ لائق صد تحسین ہے۔ شاعری میں اس کا اظہار اس طرح سامنے آیا ہے۔

جب بادشاہ نے درستگی کے لئے　　قلم ہاتھ میں پکڑا

تب ہر سطر شاہکار بنی　　اور ہر لفظ معتبر ٹھہرا

علی شیر نوائی کے بہت سے دیگر اہم کاموں میں خمسہ بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پانچ رزمیہ نظموں کی صورت میں موجود ہے۔ایک طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظامی گنجوی کے خمسہ کی کسی حد تک نقل ہے۔

1۔ حیرت ال ابرار (صالح لوگوں کے اسرار)　2۔ فرہادو شیریں

3۔ لیلیٰ ومجنون　4۔ سبعہ سیّار (سات سیارے)

5۔ سدسکندری (سکندراعظم کے بارے)　6۔ لسان اطیر

نوائی کے خمسہ کی دوسری داستان شیریں فرہاد جو 1484ء میں لکھی گئی اس کا شمار کلاسیک میں ہوتا ہے۔رومیو جیولیٹ کی طرح کی رومانی داستان وسط ایشیا کی محبوب کہانی۔ اسی طرح چار موسموں پر بھی قصیدے ہیں۔

ترک شاعروں کی نوائی نے بہت مختلف انداز میں بھی تربیت کی۔''میزان ال اوزان'' یعنی میٹروں فاصلوں پر بھی شاعری کی اصطلاحیں ایجاد کیں۔''مجالس ال نفیس'' میں بڑے لوگوں کی مجلسی محفلوں کے آداب پر پوری عصری شعرا کی سوانح حیات اور اُن کے کام کی تنقیدی جائزوں پر مشتمل کتاب 450 خاکوں پر مشتمل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مجموعے کو سونے کی کان سے مشابہت دی جاسکتی ہے کہ جس نے امیر تیمور کے زمانے کی خوبصورت ثقافتی اور دلکش تصویریں کھینچ دی ہیں۔

لسان اطیر ایک رزمیہ نظم بظاہر پرندوں کی بولیوں پر مگر ایک بے حد انوکھی وضع کی کتاب جو اس کے فلسفیانہ اور صوفیانہ نظریات پر مبنی ہے۔انسان جسے خدا کی ضرورت ہے اور تلاش ہے۔ دنیا بھر کے پرندوں کو مثالیہ انداز میں کردار بناتے ہوئے جو اپنے بادشاہ سے

دوراوراس کی کھوج میں ہیں۔

Waqfia وقفیہ بھی نوائی کا ایک اہم دستاویزی کام ہے۔اسے بھی 1481ء میں فینی کے نام سے لکھا گیا۔اس میں شاعر کی دنیاداری سے بھری ہوئی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔رومانیت کا وہ کس حدتک قائل تھا اوراس کی روزمرہ زندگی میں اس کا کتنا دخل تھا۔ اس کے تشنہ خواب،اس کی ادھوری رہ جانے والی خواہشوں سبھوں کے عکس اوران کا اظہار بہت دل پذیر انداز میں سامنے آتا ہے۔Wagfiya تیرھویں صدی کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی بہترین عکاسی کرتی کتاب ہے۔ اسی طرح لیلیٰ مجنون چھتیس ابواب پر مشتمل3622اشعار پر مشتمل۔یہ بھی انہی سالوں میں لکھی گئی۔

سروج المسلمین ۔ یہ اوراہم کام ہے۔اسلامی قوانین اوراسلام کے پانچ اہم ستون شریعہ،نماز،روزہ،زکوٰۃ اور حج۔اُسے حکومت ازبکستان نے 1992ء میں بہت اہتمام سے چھاپا۔

نورالدین عبدالرحمٰن جامی کی نغمات انس کو چغتائی ترکی میں ترجمہ کیا۔اوراسے کیا خوبصورت نام دیا۔نسیم المحبت ۔اس کے صوفیانہ اور مذہبی خیالات اس کتاب میں بھرپور انداز میں سامنے آئے۔فارسی کی شاعری بھی 6000لائنوں پر مشتمل ہے۔

نوائی کا آخری شاہکار کام Muhakmat al-Lughatayn محاکمتہ اللغتین کا ہے۔1499 میں لکھی جانے والی یہ کتاب دراصل دوزبانوں کے درمیان ادبی تقابلی جائزہ لیتی نظر آتی ہے۔یہ کام بھی وہ بڑے دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔

ذرادیکھئیے عورت کے چہرے پرحسن کے نشان کے لیے ترکی میں جولفظ موجود ہے وہ فارسی میں نہیں۔چغتائی زبان میں الفاظ کے تین چار معنی بہت عام ہیں۔جبکہ بقول نوائی کے فارسی میں نہیں۔یعنی دوزبانوں کا موازنہ۔فارسی اورترکی کی صورت میں ہوا۔

جہاں بہرحال انہوں نے بڑے مضبوط دلائل سے ترکی زبان کی وسعت پذیری، اس کا لوچ، رس اور صحت کو افضل گردانا۔

یورپ میں علی شیر نوائی کے نام اور کام سے شناسائی بہت دیر میں ہوئی۔ ڈینس ڈیلی Dennis Daily کو پڑھیئے کہ وہ اس ضمن میں کیا کہتا ہے۔

تمہارے سامنے ایک خداداد لکھاری ابھرتا ہے جو شاید تمہارے لیے میری طرح نہیں ہو۔ میرے لیئے تو سب سے پہلا سوال خود اپنے آپ سے تھا کہ یہ شاعر کون ہے؟ اور میں نے اس کے بارے اب تک کیوں نہیں سُنا اور پڑھا؟ میری عمر کے بہت سے لوگوں کی طرح میری بھی توجہ اور تعلیم مغربی ادب پڑھنے پر ہی مرکوز رہی۔ پھر جب دوسرے خطوں کے ادب نے توجہ کھینچی تو سب سے پہلے فارسی کے صوفی رومی اور حافظ نے متاثر کیا۔

مگر نوائی کو پڑھنا کتنا حیرت انگیز تھا۔ رومی اور دوسرے شعرا کی طرح نوائی کی نظمیں بھی اپنی ظاہری چمک دمک کے ساتھ ساتھ معنی کی بھی بہت گہرائی میں اُترتی ہیں۔ پڑھنے میں لُطف دیتی، دوبارہ اور سہ بار پڑھنے پر اُکساتی آپ کے قلب ونظر میں سکون اتارتی چلی جاتی ہیں۔

دیکھیے ذرا۔

کتنے سال میں گوشہ نشین رہا
خواب، خواہشیں اور منظر اکساتے ہیں
کتنے سال میں نے خود کو چھپایا
کہ زندگی کے موتیوں کی کھوج کروں
یہ حیران کرنے والی بات نہیں
کہ نوائی صحرا کی طرف چل پڑا

اس تسکین کے حصول کے لیے
جو درد عشق نے پیدا کیا
اور یہی تو وہ ہے جو اس کے اندر گہرائی میں اُتر گیا
ذرا اِسے پڑھیئے۔
میرے نزدیک ذہنی وسعت اور خوش نصیبی کے بغیر
بے صبری کی آگ بھسم کر دینے والی ہے
عقل و خرد کے محافظ غائب ہو گئے ہیں
اور میر کارواں متوقع آگ سے بچاؤ کے لیے بے بس ہے
ایک برق سی کوندی ہے اور اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا
بھیڑ کا بہاؤ پھٹتا ہے
اور جیسے آگ کا سمندر سا بن جاتا ہے
سمجھو
نوائی میں اپنے درد سے منکر ہو جاتا ہوں
جیسے Masandran کے جنگل آگ سے سرخ ہو جاتے ہیں۔
یہاں نوائی کا ایک اور انداز دیکھیئے۔
تمہارے بغیر بہار میرے لیئے
دوزخ جیسی ہی ہے
جو بن پر کھلا ہوا سرخ پھول
جیسے دہکتی آگ ہو
یہ ہرگز عجیب بات نہیں

کہ جنت بھی دوزخ جیسی ہی ہے
اگر وہاں تمہاری دید نہیں
اس کے خوابوں کی فینٹسی جب مجھے محسوس ہوتی ہے
میرے چہرے پر آنسو درد وغم کی جھریوں کی قطاریں بنا لیتے ہیں
طبیب بیمار آدمی کے لیے لذیز پھل تجویز کرتا ہے
یہ حیرت کی بات نہیں
اگر تمہارے شریں لب تضحیک آمیز رویہ اختیار کریں
بے رحم حسینہ، ستم گر حسینہ
روح اپنی عدم وجودیت میں کسی ہاتھ تھامنے کی متمنی ہو رہی ہے
کیونکہ اسے احساس ہے
یہ وجود اپنی صورت میں بڑا ٹیڑھا اور گنوار ہے
مت کہو کہ نوائی بے لباس ہے
نہیں وہ پہنتا ہے
عدم وجودیت کا چوغہ
بد قسمتی کا پیرہن جسے جھوٹ نے سیا ہے
دسویں دن کا چاند جب کمان کی صورت رہ جائے
تب آسمان
بادشاہ کے نیلے گھوڑے کے سامنے شاہی نقیب بن جاتا ہے
اسے بھی پڑھیئے اور سر دھنیئے ۔
میں تمہارے بغیر زندگی گزارنا

جان گسل اذیت سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔

اے روح مر جانا بہتر ہے
بجز راس زندگی کے جو تمہارے بغیر گزرے
مردے سانس نہیں لیتے
میری آہ و بکا اور چیخ و پکار بے ثمر ہے
اگر تم مجھ پر نظریں نہ ڈالو۔
یہ ایسے ہی ہے
جیسے دنیا کی نظروں سے اوجھل بلند و بالا پہاڑوں پر بجلی چمک جائے
میرے رنج والم و وارفتگی کے کوئی معنی نہیں تمہارے بغیر
بالکل ایسے ہی جیسے پہاڑوں پہ بجلی گرے
رنج والم اور فکر سے مردوں کو بھلا کیا غرض
لیکن تم سے جدائی کا رنج مجھے چور چور کر دیتا ہے
جدائی کی تکلیف سے آسمان میرے سر پر پھٹ گیا ہے
دیکھیں یہ دن آخر کار کیا رنگ دکھاتے ہیں
اگر تم عہد وفا کرو تو نوائی لافانی ہو جائے
تم سے جدا ہو کے تو اک پل بھی ممکن نہیں میرا زندہ رہنا
میری خواہش ہے کہ کبھی کسی پر ایسا مشکل وقت نہ آئے
جیسا کہ مجھ پر ہے
تمہارے بغیر میری ہوش مندی، عقل و خرد اور کارِ دُنیا سب بیکار ہیں

سچ تو یہ ہے کہ نوائی وسط ایشیا کے ترک لوگوں کے محبوب شاعروں میں سب سے

اہم نام ہے۔ اُسے بلا شک وشبہ چغتائی زبان وادب کا بہت بڑا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ اس زبان پر اس کی مہارت اور کام کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اُسے نوائی کی زبان کا ہی درجہ دے دیا گیا ہے۔ سوویت اور ازبک ذرائع کا اعتراف ہے کہ ازبک زبان کا بانی بلا شبہ نوائی کو ہی کہا جا سکتا ہے۔

1941ء میں پورے سوویت یونین میں نوائی کا پانچ سو سالہ جشن منایا گیا تھا۔ پورے وسط ایشیا میں بے شمار مقامات اور جگہیں اس کے نام پر منسوب ہوئیں۔ تاشقند میٹرو اسٹیشن، انٹرنیشنل ائیر پورٹ۔

تاہم اب آزادی کے بعد ازبکستان نے اپنے شاعر کو ابدیت کا پھول کا ٹائیٹل اس کی پانچ سو اکہترویں 571 سالگرہ کے موقع پر دیا ہے۔

اس کی نظم کے اس بند سے اُسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اِسے ختم کرتی ہوں۔

گرینائیٹ کے انبار میں موتی کی طرح
راکھ کے ڈھیر میں دہکتے کوئلے کی طرح
کانٹوں کے درمیان سرخ گلاب کی طرح
اور بے جان وجود میں ایک صاحبِ علم روح کی طرح

☆☆☆

باب 3 سمرقند

- مشرق کا روم، اسلامی دنیا کا قیمتی موتی اور بازنطینی چہرہ۔
- کہیں بلندیوں، کہیں گھاٹیوں اور کہیں ترائیوں میں سفر کرتی شاہراہ ریشم پر سفر کرتے ہوئے ماضی اور حال ساتھ ساتھ چلتا ہے۔
- سوویت کے زمانوں میں سمرقند و بخارا کے صاحب ثروت لوگوں کے محل نما گھر ضبط ہونے کے ڈر سے رشتے داروں کے تصرف میں، اور آزادی کے بعد ہوٹلوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔
- امیر تیمور کو سمرقند سے عشق تھا، ویسا ہی عشق جیسا کسی بوڑھے مرد کو کسی خوبصورت، جوان اور حسین لڑکی سے ہوتا ہے۔
- سمرقند کے لوگوں کا پہناوا مغربی ہے۔ بس بڑی بوڑھیاں دیہاتوں میں اپنے قدیمی ملبوسات میں نظر آتی ہیں۔

تو ہم اب سمرقند کی جانب رواں دواں تھے۔ اُسی عظیم شاہراہ ریشم پر جو صدیوں سے لوگوں کے قدموں کی خاک بنی انہیں نئی دنیاؤں میں لے جاتی اور واپس لاتی تھی اور ابھی بھی اسی عادت کو اپنائے ہوئے ہے۔ تاہم اب سبک اور تیز رفتار گھوڑوں پر نہیں، بلکہ عصر حاضر کی خوبصورت اور جدید ترین ٹرین میں انتہائی آرام دہ سیٹوں پر بیٹھے اور شفاف شیشوں سے باہر دیکھتے ہوئے۔

یہ اور بات ہے کہ تا حدِ نظر گندم کے سنہری کھیتوں کے پسِ منظر میں بلند و بالا پاپلر کے درختوں کی قطاروں متوجہ کرتی تھیں۔صنوبر کے جُھنڈوں میں کہیں کسی پری چہرہ کا رُخ زیبا لشکارا سا مارتا تھا۔کہیں ڈھلانی چھتوں والے گھروں کے آنگنوں میں خوبانی اور آلو بخارے کے پیڑوں پر پیلی اور چنبیلی رنگی پکی خوبانیاں اس گھر میں کودنے اور انہیں توڑنے پر اُکساتی تھیں۔ دیواروں پر پھیلی انگوروں کی بیلوں میں چُنے مُنے سے انگوروں کے گُچھے نظروں کو معصومانہ مسرت سے بھرتے تھے۔کھیتوں میں کام کرتے کسانوں اور کہیں کہیں گرد وغبار کے اُڑتے بادلوں کو دیکھتے ذہن کہیں دُور چلا جاتا۔

تب ان منظروں میں حریر و دیبا اور سلک کے لہراتے تھان بھی بند شیشوں سے آٹکراتے۔نتھنوں میں لونگ وزیرے کی خوشبوئیں گُھسی جاتیں۔ہاتھی دانت،نقیش سونے چاندی کے ظروف،سبک و تیز رفتار گھوڑوں پر بیٹھے شہ زور جیالے اور اونٹوں کے قافلے بھی خیالوں میں دوڑے آتے۔

ازبکستان کا بڑا سا نقشہ میں نے گھٹنوں پر کھول کر پھیلایا تھا۔مسکراہٹ بے اختیار میرے ہونٹوں اور آنکھوں میں بکھر گئی تھی۔پچھّم سے پُورب اور دکن سے اُترّ تک کہیں بلندیوں،کہیں گھاٹیوں اور کہیں ترائیوں میں سفر کرتی اِس عظیم شاہراہ کو اونٹوں کے قافلوں سے نمایاں کِیا گیا تھا۔بس Jizzax ریلوے اسٹیشن سے آخری کوئی پندرہ میل کا ٹکڑا ریلوے لائن اور سڑک کا سیدھا کر دیا گیا ہے کیونکہ یہاں سے شاہراہ ریشم ایک طویل خم کھاتی سمرقند تک جاتی ہے۔

امیر تیمور کو سمرقند سے عشق تھا۔ویسا ہی عشق جیسا کِسی بوڑھے مرد کا کِسی خوبصورت جوان اور حسین لڑکی سے ہوتا ہے۔

’’وہ جہاں بھی گیا لوٹ کر میرے پاس آیا‘‘ پروین شاکر کا یہ خوبصورت مصرعہ

صدیوں پہلے سمرقند نے بھی تیمور کیلئے کہا ہوگا کہ اُس نے جس مُلک پر بھی چڑھائی کی۔ جسے بھی اپنے قدموں تلے روندا۔ وہ وہاں نہیں ٹھہرا خواہ وہ کتنا ہی خوبصورت، کتنا ہی شاہانہ کرّ وفر والا ہوتا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ شہروں کو چھوڑنے سے قبل وہ سمرقند کیلئے وہاں کے نادر شاہکار لانا نہ بھُولتا۔ اُس عاشق کی طرح جو اپنی محبوبہ کے لیئے سوغاتیں لانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ تبریز کے دودھیا سنگ مرمر، ہرات کی ٹائیلوں، بغداد کے نازک نقرئی کام، ختن کے پاکیزہ یشب۔

سچ تو یہ تھا اُس نے سمرقند کو سجا دیا تھا۔ یہ شہر اُس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ قدیم مشرق کی جنت۔ اسلامی دُنیا کا قیمتی موتی۔ مشرق کا روم۔ بازنطینی چہرہ۔ سب سمرقند کیلئے کہا گیا ہے۔

تاہم ان سب کے باوجود یہ تباہیوں سے بہت بار ہم کنار ہوا۔ کئی دفعہ آگ میں جلا۔ حملہ آوروں کی بربریت کا شکار ہوا۔ جس نے اس کے چہرے کی تاریخ پر اپنے نشان چھوڑے۔

تو اب بھلا مجھے حافظ شیرازی کیوں نہ یاد آتا؟ آیا اور پورا منظر جیسے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ شیراز کو فتح کرنے کے بعد تیمور وہیں تھا جب اُس نے خواجہ حافظ شیرازی کو طلب کیا۔ حافظ بہت سادہ لباس میں حاضر ہوا۔ تیمور نے قدرے خفگی سے پوچھا یہ تمہارا ہی شعر ہے۔

اگراں تُرک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

تعظیمی ادب آداب کے بعد ہاں کہا گیا۔ تیمور بولا۔

”میں نے کن جتنوں اور کن مصائب سے سمرقند و بخارا کو فتح کیا اور اب اُسے

دُنیا بھر کے شاہکاروں سے سجا رہا ہوں اور تم ہو کہ اُسے شیراز کی کسی دو ٹکے کی چھوکری کو اُس کے تل پر بخش رہے ہو۔

حافظ نے ایک لمحہ تامّل کیا۔ پھر مسکرایا اور بولا۔

''اے شاہ شاہاں یہ جو میں اِس حال کو پہنچا ہوا ہوں تو یہ میری ایسی ہی غلط بخششوں کا نتیجہ ہے جو بھگت رہا ہوں۔''

تیمور جواباً ہنس پڑا اور انعام و اکرام سے نواز کر رُخصت کیا۔

تو اب قدم رکھتے ہیں اسی سرزمین پر۔ وقت کے اُس عظیم شاہ کے محبوب شہر کی دھرتی پر۔

اسٹیشن کی عمارت میں جدیدیت کے جلال کے ساتھ ساتھ قدامت کے حُسن کا ٹچ touch بھی تھا۔ ہم چاروں یعنی سیما پیروز، شہناز مزمل، مہر النساء اور میں اسٹیشن کے احاطے کو درختوں، پھولوں، پودوں اور گھاس کے قطعوں میں بٹا اور لوگوں کے جمّ غفیر کو دیکھتے ہوئے محسوس کرتے تھے کہ ہڑبونگ اور افراتفری کہیں نہیں ہے۔ ایک منظّم سی آمد و رفت کا سلسلہ ہے جو تا حد نظر پھیلا ہوا ہے۔

الیگزینڈر Alexender ہمارا گائیڈ آرتھوڈوکس orthodox روسی ہے سمرقند میں مقیم ہے۔ ہمیں لینے کیلئے آیا ہوا ہے۔ منحنی سے جسم کا نوجوان لڑکا جو ہوٹل لے جاتے ہوئے ہم سے باتیں بھی کیئے جا رہا ہے۔ اُس کا دادا دادی کوئی پون صدی قبل روس سے نقل مکانی کر کے سمرقند سیٹ ہوئے تھے۔

وہ ہماری طرف میٹھے سے انداز میں دیکھتے ہوئے کہتا ہے۔

''میری دادی سمرقند کے مضافاتی قصبے بلنگر (Bulungur) میں اکیلی رہتی ہے۔ اُسے اپنے مسلمان ہمسایوں سے بہت پیار ہے۔ وہ سب اس کے خونی رشتوں سے

بڑھ کر ہیں۔ اُسے کبھی روس جانے کا کہیں تو انکار کرتی ہے۔

اور الیگزینڈر کی باتیں سُنتے ہوئے میں سوچے چلی جارہی تھی۔ مختلف مذہب کے لوگوں کا اکٹھا رہنا اور ایک دوسرے کے ساتھ انسانیت کے حوالوں سے گزارہ کرنا انسانی سرشت میں رواداری، محبت اور برداشت جیسی خوبیوں کو جنم دیتا ہے۔ ہمیں اِن جذبوں کی بہت ضرورت ہے؟

سمرقند کا کلچر ایرانی، ہندوستانی، منگولین، مغربی اور مشرقی ثقافتوں کا آمیزہ ہے۔

برہان الدین مرگینو نائی سٹریٹ نمبر 26 میں ہمارا ہوٹل کا میلا Kamila تھا۔ گلی شکستہ سی تھی۔ محلے قدیم تھے۔ مرکزی شاہراہ کے ساتھ ساتھ کا علاقہ توڑ پھوڑ اور مرمت وتعمیر جیسے کاموں میں پھنسا ہوا نظر آتا تھا۔

میری تینوں ساتھیوں کی ناک بھوں چڑھی ہوئی تھی۔ میں اطمینان سے بیٹھی منتظر تھی کہ دیکھو شاید گدڑی میں چُھپے لعل نظر آجائیں اور وہی ہوا کہ بڑے سے چوبی گیٹ سے اندر داخل ہوئے تو ٹھٹھک کر رُکنا پڑا تھا کہ سامنے اپنے قدیم تہذیبی رنگوں میں گندھا جدیدیت کے ساتھ ایک وسیع وعریض محل تھا۔

الیگزنڈر بتاتا تھا۔ سوویت کے زمانوں میں سمرقند و بخارا کے صاحب ثروت لوگوں نے اپنے محل نما گھر اور حویلیاں اپنے رشتہ داروں سے بھر لی تھیں کہ یہ حکومت کی نظروں میں نہ آجائیں وگرنہ تو ضبط ہونے لازمی تھے۔ جونہی سوویت سے الگ ہوئے۔ آزادی کا علان ہوا۔ اِن گھروں نے نئے چولے پہن لیئے۔

اب دم بخود کھڑے دیکھتے ہیں۔ دُور تک جاتی بالکونیاں ان کی چوبی ریلنگ، باغیچوں میں خوبانی، چیری، توت کے درختوں کی بہتات۔ دیواروں پر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے سمرقند کی معاشرتی زندگی کی جھلکیاں مصوروں کے نوک بُرش کے کمالات

کی صورت آویزاں تھیں کہ جنہیں پہروں دیکھو اور جی نہ بھرے۔

چوبی گول شہتیروں اور کندہ کاری سے سجے ستونوں میں گھرے برآمدے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھے چرچک (بڑے سے تخت جن کے چاروں طرف چوبی ریلنگ ہوتی ہے جس کے درمیان میں دھری میز پر خاندان ناشتہ کرتا اور کھانا کھاتا ہے) دھرے تھے۔ کہیں متوط شدہ باز تھے اور کہیں تالاب میں فواروں سے موتی گرتے تھے۔

منظر سمرقند کے راجستھانی سکوائر کا تھا۔ اُونی نمدوں بیٹھے پر کھلے بازوؤں والے عبائیں پہنے باریش مرد آگ تھاپتے قہوے کی پیالیاں ہاتھوں میں پکڑے کسی دُور سے آنے والے جوڑے سے بات چیت کرتے تھے۔ یہ جوڑا گدھے کی مہار پکڑے جس رنگ ڈھنگ سے کھڑا تھا اُن کا انداز اور لباس دونوں کمال کے تھے۔ اِن تصویروں نے میری ساری تھکن کو کسی بلاٹنگ پیپر کی طرح چُوس لیا تھا۔

دوپہر کا کھانا ایک ڈھابے نما ریسٹورنٹ میں تھا۔ بڑا سا پکّا ہال نما کمرہ جس میں دھری میزوں پر ازبک نوجوان لڑکے بیٹھے گپیں مارتے اور کھانا کھاتے تھے۔ سروس دینے والی لڑکیاں تھیں۔ ٹخنوں تک لونگ سکرٹ اور ایپرن پہنے۔ سامنے پردوں کے پیچھے کھانے کے دیگچے و پتیلے ہوں گے۔

ازبک پلاؤ۔ سوئے اور پودینہ کے پتوں، ٹماٹر، پیاز اور کھیرے کا سلاد۔ لسّی نما دہی کے پیالے آئیران (ترکی لفظ) اور قہوہ۔ پیٹ بھر کر کھایا اور دل میں شکایت کی کہ ہائے کشمش کیوں اتنی تھوڑی تھی۔ وہاں چرواک میں پلیٹ میں ہر طرف اسی کے جلوے تھے۔ دراصل ماٹھا سا ہوٹل تھا نا۔

پیٹ پُوجا سے فراغت پاتے ہی ہمیں امام بخاری محمد بن اسماعیل کے حضور حاضری کیلئے بیتابی سی ہونے لگی۔ الیگزینڈر نے کہا امام بخاری کے مزار پر حاضری میرے

خیال میں سب سے پہلے۔ گاڑی میں بیٹھے تو دورویہ سڑک کے کنارے درختوں اور فصلوں کی ہریالی سے آنکھیں تازہ کرتے اور اُس عظیم ہستی کے کام کو خراج پیش کرتے سمرقند کے مضافات سے گزرنے لگے۔

کیا شخصیت تھی۔ خراسان میں پیدا ہونے والے اس غیر معمولی بچے نے سولہ سال کی عمر میں علم کے حصول کیلئے سفر کرنا شروع کردیا تھا۔ علم اور تحقیق کی جستجو ہڈیوں میں رچی ہوئی کہ سولہ سال سے سفروں کا آغاز کردیا اور اس وقت کے اسلام کے سب اہم مراکز میں حاضری ہی نہیں دی۔ طویل عرصہ قیام بھی کیا۔ عالموں سے رابطے اور ان کی خدمت میں کافی وقت گزارنے، اُن کے علم سے مستفید ہونے اور خود کو اُس مقام پر لانے میں اُن کا بہت وقت گزرا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے 1000 آدمیوں سے 700000 حدیثوں کی رواتیں سُنیں۔ تحقیق و جستجو کے مرحلوں سے گزرتے گزرتے آخر میں 7275 کو معیار کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد مرتب کیں۔ سُنّی مسلمانوں کے نزدیک قرآن کے بعد وہ ایک مستند اتھارٹی authority ہیں۔

دھوپ جوبن پر تھی۔ سمرقند کا یہ مضافات لہلہاتی فصلوں اور سبزے سے اٹا پڑا تھا۔ وہ جو کہا گیا ہے سمرقند دریائے زرفشاں کا حسین نخلستان ہے کتنا صحیح تھا۔

اُن کا مقبرہ ایک جید عالم کے رُتبے اور مرتبے کے شایان شان تھا۔ وسیع و عریض پختہ راستے، میدان، اطراف میں مسجد اور درس و تدریس کے سلسلے میں عمارات کا لمبا چوڑا سلسلہ نظر آتا ہے۔ فاتحہ خوانی کی۔ گائیڈ سیاحوں کے ٹولے لیئے کھڑے انہیں لکچر دے رہے تھے۔ ہمارے گائیڈ نے بھی ایسی کوشش کی۔ ہم تو پلّہ چھڑا کر بھاگے۔

مسجد میں جا کر فوراً نفل پڑھے۔ گائیڈوں کی یاوہ گوئیاں مجھے کبھی متاثر نہیں کرتیں۔ شاید میں کتابوں کو پڑھتی ہوں۔

سمرقند کا راجستھان سکوائر جو صدیوں تک سمرقند کا دل رہا۔ بہت چرچا سُنا تھا اِس کا۔سکوائر کی خوبصورتی، وسعت اور اس میں کھڑے تین مدرسے تعمیر کے ایک جیسے شاہکار بہت متاثر کُن تھے۔دھوپ کی شدت میں وہ توانائی نہیں تھی۔اسی لیئے پہلے تو تھوڑی دیر فرصت سے بیٹھ کراس منظر سے آنکھیں سینکیں۔ہوائیں پھانکیں۔

اب ماضی میں جھانکنا شروع کیا۔یہ پبلک سکوائر اُن کا سنڈے بازار تھا۔جہاں سفید اور سیاہ اونی نمدوں سے بنے عارضی چھپروں تلے خرید وفروخت کے سلسلے چلتے تھے۔ یہ اُن کی چوپالیں بھی تھیں۔یہاں شام کی خنک ہواؤں میں وہ الغوزے بجاتے اور رودکی کے گیت گاتے اور سُنتے پہروں گزارتے۔آسمان کے آلاؤ جلتے رہتے اور آسمان کے ستارے مسکراتے رہتے۔پریڈیں دیکھتے،تہوار مناتے۔اہم مقدمات کے فیصلے سُنتے۔گپیں ہانکتے اور قصّہ گوئیوں سے قصّے سُنتے سُنتے بچوں سے جوان اور جوانی سے بڑھاپے میں داخل ہوجاتے۔علمِ طبیعات پر بحث ہوتی۔بُو علی سینا زیر بحث آتا۔ارسطو کے بخئیے اُدھیڑتے۔زندگی کا یہ دلفریب سا رُخ کتنا حسین، کتنا خوبصورت تھا۔کل بھی تھا اور آج بھی اسی انداز میں جاری وساری ہے۔

میری ساتھی تو مدرسے دیکھنے چلی گئی تھیں۔میں وہاں دیر تک اِن تصوراتی منظروں سے لطف اندوز ہوتی رہی۔پھر کہیں اُٹھی اور اور تعمیر کے اِن شاہکاروں کے قلب میں جھانکا۔

الغ بیگ کا مدرسہ۔امیر تیمور کا پوتا جو فلکیات کا ماہر اور ایک قابل فخر ریاضی دان تھا۔حکمرانی سے کہیں زیادہ اُسے تو تدریس سے دلچسپی تھی۔وہ تو اپنی موت تک اِس مدرسے میں پڑھاتا رہا۔

الغ بیگ کا مدرسہ پندرہویں صدی کی تعمیر جس کی بلند و بالا

محرابیں، دروازے، مینار اُن پر کی گئی نقاشی سب کا دیکھنے سے تعلق تھا۔ یہ الغ بیگ کی علم سے دلچسپی اور محبت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ بغداد کے عباسی خلیفہ مستنصر کی طرح جس نے مدرسہ مستنصریہ بنایا اور ہر روز وہاں جانا بھی اپنا معمول ٹھہرایا۔

شیر دور Sher Dor مدرسہ سمرقند کے حکمران یالنگتش بہادر نے اِسی طرز پر بالمقابل الغ بیگ مدرسہ کے سترھویں صدی میں تعمیر کروایا۔ یہ مدرسہ وسط ایشیا اور سمرقند کے امیر ترین خاندانوں کے بچوں کیلئے تھا جو یہاں دس سے بیس سال تک قیام کرتے۔ بنیادی تعلیم کا مقصد قرآن کا حصول اور اس میں مہارت تھی۔ بقیہ مضامین کا انتخاب طلبہ کی پسند پر ہوتا۔

بہت سالوں بعد اسی حکمران نے طلاکاری مدرسہ بھی بنوایا۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ سونے کی نقاشی سے مالا مال تھا۔ یہ دونوں کے داہنی سمت ہے۔ بیرونی منظر نامہ میں ایک جیسا تاثر دیتا ہوا پر اندرونی حصّے میں ایک منزلہ۔ یہ بظاہر مدرسہ کی صورت میں نظر آنے والا مسجد کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ دراصل اس کے مینار قدرے چھوٹے ہیں۔

الغ بیگ کی رصدگاہ کو دیکھنا اور اُس عظیم انسان کے بارے میں جاننا بھی اپنے ماضی سے شناسائی کی خوبصورت کوشش تھی۔

امیر تیمور کا پوتا اور شاہ رخ کا بیٹا جس کی ایرانی ماں گوہر شاد تھی۔ الغ اپنے بچپن ہی سے ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے شہروں میں گھومتا رہا۔ فلکیات سے اُس کی بے پناہ دلچسپی نے یہ رصدگاہ تعمیر کروائی۔

سیڑھیوں کا لمبا چوڑا سلسلہ اور رصدگاہ کا نظارہ۔ اِس کے فلکیات کے علم سے متعلق وقت کے پیمانوں منٹوں سیکنڈوں میں حساب کتاب اور زمینی محور کے بارے نئے انکشافات اور ریاضی میں کم از کم آٹھ اعشاری جگہوں تک اُن کے بنیادی مثلثی

ٹیبلز tablesاور مماس کی درستگی جن کی صحت کا اعتراف بیسویں صدی کے ریاضی دانوں نے کیا۔

سوویت یونین نے 1987ء میں اس کے علم کو خراج پیش کرتے ہوئے ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔

ہمیں کیا خاک اُن مشینوں کی سمجھ آنی تھی۔ہم نے تو حیرت سے اُس سرنگ کو دیکھا جو لمبی دُور تک چلی گئی تھی۔پہلی دفعہ توجہ سے گائیڈ کو سنا اور اُس بلند جگہ سے نیچے بکھرے سمرقند شہر کو دیکھتے اور کتابچہ پڑھتے ہوئے الغ بیگ کو محبت بھرا اسلام اور دُعا بھیجی۔

''الغ بیگ ہم تم پر نازاں ہیں۔''

شاہی زندہ دیکھنا بھی کون سا کم معرکہ تھا۔ایک تو داخلی دروازے سے ہی نظر آتی بے حد وحساب عمودی سیڑھیاں اس پر طُرّہ ہم چاروں کے بحث مباحثے۔ایک بازار کیلئے بے چین کہ شاپنگ اس کا کریز ہے۔ایک حضرت دانیال کیلئے مری جارہی تھی۔ایک امیر تیمور کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے بے تاب و بے چین نظر آتی تھی۔اور وہ کون تھی؟ وہ یقیناً میں تھی کہ تیمور کی عاشق صادق تو میں ہی تھی۔اور ایک اُوپر جانے کیلئے۔

سیڑھیاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی درمیان میں فاصلہ بہت۔بوڑھی ٹانگیں کتنا بوجھ اُٹھائیں گی۔

''ارے بازار تو کل دیکھ لیں گے۔سیما نے کہا تھا۔ان سے تو نپٹیں جن کے لیئے آئے ہیں۔''

شاہی زندہ کا داخلی دروازہ بہت شاندار ہے۔اس کے تھڑے پر بیٹھ کر ہم نے پستہ قامت افراسیاب پہاڑی کی ڈھلانوں پر پھیلے اِس شاہی قبرستان کو للچائی نظروں سے دیکھا جہاں حضورؐ کے عم زاد قاسم ابن عباس اور مسلمانوں،عیسائیوں اور یہودیوں تینوں

بڑے مذاہب کے نزدیک محترم ومعتبر حضرت دانیال دفن ہیں۔

ایک تو مجھے حضرت دانیال کی سمجھ نہیں آتی کہ یہ کہاں کہاں دفن ہیں؟ اسکندریہ میں ان کے مزار کو دیکھنے اور فاتحہ خوانی کیلئے سومہ سٹریٹ پر خجل ہوتے ہوتے مَیں ایک یہودی کی دوکان میں جا گھسی جس نے میری ہانپتی کانپتی صورت دیکھتے ہوئے پانی پلایا۔ چائے پلائی اور بسکٹ کھلائے اور ساتھ میں اپنا نوکر بھیجا کہ وہ مجھے حضرت دانیال کے مزار پر چھوڑ آئے۔ عمان میں بھی شُنید ہے اور یہاں بھی۔

اوپر کی دُنیا بھی عجیب سی تھی۔ ایک تو شام اُوپر سے بلند و بالا دیواروں میں گھری راہداری سے ہوتے ہوئے حضرت قاسم کے مقبرے کی زیارت کی۔ فاتحہ پڑھی اور ٹوٹے پھوٹے خستہ حال راستوں سے گزرتے حضرت دانیال کے پاس پہنچے۔ نوگزے جتنا لمبا تعویز۔ روایت ہے کہ انہوں نے قبر میں بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ یہاں تو خوف محسوس ہوتا تھا۔ بہرحال فاتحہ پڑھی اور بازار کی دُنیا میں لوٹے کہ بور ہو گئے تھے۔ تھک گئے تھے۔

اور اب مقامی دستکاریاں تھیں۔ شالیں، سکارف اور سٹول تھے۔ مقامی سونیئرز تھے۔ ہم اگر چار عورتیں خریدار تھیں تو پوری مارکیٹ بھی عورتوں کے قبضے میں تھی۔ کیا سبزی ترکاری، کیا پھل، کیا میوہ۔ سب پر ازبک عورت ڈٹی بیٹھی کِس مہارت سے بھاؤ تاؤ کرتی تھی۔

رات کا کھانا بڑے روایتی ہوٹل میں کھایا۔ چوبی ستونوں اور کشیدہ کاری کی چادروں سے مزین چھت والے برآمدے میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ کر جہاں کھانے کیلئے آنے والے خاندانوں کی عورتوں نے ہی رقص کا تھوڑا سا ہلاّ غلاّ کیا۔

الیگزینڈر نے سمرقند کی پیداوار کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

دُنیا کی بہترین کپاس کیلئے سمرقند اور فرغانہ مشہور ہیں۔ چاول اور لوسرن بھی بہت پیدا ہوتا ہے۔ کھیتی باڑی جدید طریقے سے ہوتی ہے۔ آبپاشی کا جدید نظام رائج ہے۔

سوویت نے ازبکستان کے ہر سسٹم کو نئے اور جدید خطوط پر استوار کیا۔ پن بجلی گھروں کی بہتات ہے۔ ہم لوڈ شیڈنگ کے مارے ہوئے بے اختیار پوچھ بیٹھے۔

''بجلی کی صورت کیسی ہے آپ کے ہاں؟''

خوبصورت چہروں پر حیرت تھی۔

''بجلی تو ہمارے ہاں بہت وافر ہے۔''

کتنے خوش قسمت ہیں۔ غلامی تو کاٹی مگر فیض بھی بہتیرا پایا۔

پانی کو پمپوں کے ذریعے اوپر لا کر لوچدار پائپوں کے ذریعے بھی کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ یہاں لمبے ریشوں والی کپاس کی نئی قسمیں نکالی اور کاشت کی گئی ہیں۔ کپاس چُننے جیسا کام بھی مشینوں سے ہوتا ہے۔

سمرقند میں ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعت بھی گھریلو سطح پر خاصی منافع بخش ہے۔ سمرقند میں بے شمار کالج اور دو یونیورسٹیاں ہیں۔ سائنس تحقیقاتی ادارے بھی ہیں جو ریسرچ research کا کام کرتے ہیں۔

تیمور کے مقبرے میں چمکتا فیروزی رنگ اور فلوس ماہی کے ڈیزائن کا گنبد دیکھنے کی چیز ہے۔ نیلا رنگ تاتاریوں کا پسندیدہ رنگ تھا اور گنبد کا یہ ڈیزائن وہ دمشق سے لایا تھا کہ جب دمشق جل رہا تھا اور وہ بلندی پر کھڑا دیکھتا تھا۔

اور یہی وہ وقت تھا کہ جب امیہ مسجد کے مینار نے دُور سے اُس کی ساری توجہ کھینچ لی۔ شاید وہ چپٹی نوک دار وضع کے تاتاری گنبدوں سے مختلف اور اُن سے کہیں زیادہ خوش نما نظر آیا تھا۔

دمشق سے واپسی پر بی بی خانم کے مقبرے اور دیگر عمارات میں یہی انداز اپنایا گیا اور یہیں سے یہ تیمور کے پوتوں پڑپوتوں کے ہاتھوں ہندوستان بھی پہنچا۔

تیمور کے مقبرے کی اندرونی آرائش اپنی رنگ آمیزی، پچی کاری اور تنوع کے اعتبار سے بڑی منفرد تھی۔ مرقد کے سرہانے اور پاؤں کی جانب دیواروں پر جو ڈیزائن کاری تھی ویسی ہی میں نے بغداد میں عباسی محل میں دیکھی تھی۔

مقبرے میں بیٹھنے کا انتظام ہے۔ ہماری موجودگی میں ہی چند لوگ وہاں آئے جنہوں نے سورہ یٰسین کی خوش الحانی سے تلاوت کی۔ لُطف آیا سُن کر۔

ان کے سرہانے اُن کے اُستاد کا مقبرہ ہے۔ پتہ نہیں یہ سوال کب سے میرے ذہن میں بیٹھا ہوا تھا جو آج چھلانگ مار کر سامنے آ گیا۔

امیر تیمور فرانس میں تمہاری یادگار پر تمہیں اِن الفاظ میں خراج پیش کِیا گیا ہے۔

"یورپ کو بچانے والا۔"

عثمانی بایزید یلدرم تو آندھی اور طوفان کی طرح مشرقی یوروپ کو روندتا مغربی یوروپ کی طرف بڑھ رہا تھا جب تیمور اُس کے راستے میں آ کھڑا ہوا۔ یہ شخصیتوں کا ٹکڑاؤ تھا۔ دو عظیم سپہ سالاروں کی آپس کی تُو تُو مَیں مَیں تھی۔ پر گھاٹے میں کون رہا۔ ملت اسلامیہ۔

تم نے ایران کو فتح کِیا۔ یقیناً تمہارے اندر خلش تھی۔ شاید اسی لئیے تم نے ایرانی شیعہ علماء اور سمرقند کے علماء کو دربار میں طلب کیا اور کہا۔

''مجھے اپنے سوال کا جواب قرآن و سُنت کی روشنی میں ملنا چاہیے۔ بتائیں کہ شہید کون ہوں گے؟ میری فوج کے لوگ یا دشمن کے لوگ کہ مسلمان تو دونوں ہیں۔''

دربار پر سناٹا تھا مگر ایک حق گو عالم نے کہا۔

''حضورؐ سرورِ کائنات اس سوال کا جواب دے چکے ہیں۔''

''پس جو لوگ محض دلیری دکھانے یا اپنی حفاظت کیلئے لڑتے ہیں تو وہ قیامت کے دن مشرف نہ ہوں گے۔''

''تو اے میرے پیارے تیمور اب میں کیا کہوں کہ تم نے کیا کمایا اور کیا کھویا۔ کاش تم اُس سے مل جاتے۔

سمرقند کے لوگوں کا پہناوا مغربی ہے۔ بڑی بوڑھیاں دیہاتوں میں اپنے قدیمی رنگ میں نظر آتی ہیں۔ سمرقند اور بخارا دونوں جگہ لباس کے معاملے میں نوجوان لڑکے لڑکیاں اور عورتیں کم و بیش ایک جیسے ہی ہیں۔ اُونچا سکرٹ اور ٹوپ کہیں لمبے فراک مگر لوگوں کے چہروں پر معصومت، محبت اور خلوص کے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔

مُلک میں گو ابھی جمہوریت اُس انداز میں نہیں ہے۔ ایک طرح آمریت کا راج ہی ہے۔ ازبکستان کا اسلام کیری مووKarimov آزادی سے لے کر ابھی تک مسندِ اقتدار پر براجمان ہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ آزاد ہوں گے۔ سیاسی جماعتیں تشکیل پائیں گی اور وہ اس عمل کا حصّہ بنیں گے۔ مگر ابھی اس میں وقت لگے گا۔ آخری الیکشن میں تو بڑی لے دے بھی ہوئی کہ ہیرا پھیری اپنی آخری حدوں کو چھو گئی مگر سب آوازوں کو دبا دیا گیا۔ تاہم چند لوگوں نے اِن خیالات کا اظہار بھی کیا۔

''بنیادی ضروریات کی فراہمی بہت اچھے طریقے سے ہو رہی ہے۔ ہمیں اِن بکھیڑوں میں نہیں پڑنا۔''

☆☆☆